مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دار المصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۸۲ء سے لے کر ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپیے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپیے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۳ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۹ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی مظلومی، بربادی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کی بڑی شکایت ہے، وہ ۴۷ء کے بعد سے اسی کا دکھڑا رو رہے ہیں، لیکن اس کا جو نتیجہ ہے وہ ظاہر ہے۔ ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شود وصال — صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

بلاشبہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، اس کا اعتراف خود انصاف پسند غیر مسلم رہنماؤں کو بھی ہے، اور وہ اس کے خلاف آواز بھی بلند کرتے رہے ہیں، مگر ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، مریض و ناتواں شخص میں مدافعت کی قوت نہیں ہوتی، اور موسم کی بے اعتدالی اور ہوا کے معمولی جھونکے سے بھی اس کا مرض بڑھنے لگتا ہے اور وہ مزید عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن تندرست و توانا شخص کی قوتِ مدافعت قوی ہوتی ہے اور وہ سرد و گرم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے، موسم کی خرابی اور معمولی جھٹکے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ۴۷ء کے بعد مسلمانوں پر اتنی مشکلیں پڑیں کہ ان کی قوتِ مدافعت جاتی رہی، اور اب معمولی جھٹکا بھی ان کی ناتوانی اور کمزوری کو بڑھا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے جرمِ ضعیفی کی مزید سزا بھگت رہے ہیں۔

مسلمانوں کی مشکلات اور پریشانیوں کا حل حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے اور اپنے کو طاقت ور اور توانا بنانے میں ہے، مگر جب دیوار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں تو اسے اوپر کی لیپا پوتی سے باقی نہیں رکھا جا سکتا، مسلمان قوت و استحکام کے بغیر بیرونی حملوں سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں، ان کی بڑی خامی یہ ہے کہ ان کی نظر اپنی ان اصلی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر نہیں پڑ رہی ہے جو انھیں گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں، اور جس نے انھیں بالکل بے دم کر دیا ہے، اس کی وجہ سے وہ انھیں دور کرنے اور اپنی بنیادوں کو مستحکم کرنے سے غافل ہو گئے ہیں اور محض دیوار کی لیپا پوتی میں لگے ہوئے ہیں، اور ان کے سروں پر ادبار کی ایسی گھٹا چھا گئی ہے جو کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لیتی۔

مسلمانوں کی قوت و توانائی کا اصل دارومدار ایمان و عقیدہ کی استقامت، خیالات و نظریات کی پختگی، افکار و اعمال کی پاکیزگی اور وقت و حالات کے لحاظ سے درست فیصلہ اور مناسب راہِ عمل کے تعین پر ہے، وہ اپنے مذہب و مسلک، اپنی بنیادی خصوصیات اور امتیازی روایات کو کھو کر اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے، ان کے ملک کا آئین جمہوری اور سیکولر ہے اور وہ اس بارے میں قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کرتا، دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ایسے مسلمان کو بری نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خود غرض اور مفاد پسند لوگ مذہب سے انحراف کر کے اس میں وہ باتیں شامل کر لیتے ہیں جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر ان کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ جنون بھڑک اٹھتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت و بدگمانی پیدا ہوتی ہے، دراصل جو مسلمان اپنے مذہب کا وفادار نہیں وہ ملک و وطن کا بھی وفادار نہیں ہو سکتا، ترقی پسندی اور سیکولر نوازی کا مظاہرہ کرنے والے نہ اپنے دین کے خیر خواہ ہیں اور نہ ملک کے دوست۔

مسلمان دوسروں کے مقابلہ میں ہر شعبۂ زندگی میں نہایت پیچھے ہو گئے ہیں، اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے وہ اتنے پیچھے ہیں کہ ان سے کوئی عظیم اور برتر ذہنی و دماغی کارنامہ انجام دینے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی، تعلیم کے میدان میں وہ دن بدن پیچھے ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ کسی قوم کی عظمت و ترقی کا اصل ذریعہ تعلیم ہی ہے، اسی سانچہ میں وہ افراد ڈھل کر تیار ہوتے ہیں جن کی قوم کو ضرورت ہوتی ہے، اس پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے بڑی ریاضت و محنت، شدید مشقت و جانفشانی اور غیر معمولی مجاہدہ و جفاکشی کی ضرورت ہے جس کے مسلمان خوگر نہیں رہے، بلکہ سستی، کاہلی، تن آسانی اور آرام طلبی کے عادی ہو گئے ہیں، وہ وقت کی قدر و قیمت بھی محسوس نہیں کرتے، ان کا سارا وقت فضول کاموں، لایعنی مشغلوں اور یاوہ گوئی میں گذرتا ہے، باتیں بنانے سے ان کو خاص دلچسپی ہے، سعی مسلسل اور عملِ پیہم کو جہادِ زندگانی کی شمشیر بنانے کے فن سے وہ نا واقف ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے مسائل و مشکلات کے حل کے لیے بے عملی، جمود اور تعطل کی زندگی کو

خیرباد کہنا ہوگا، اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو یکسوئی، انہماک، مستعدی، دیانتداری اور ایمان داری سے انجام دینا ہوگا اس فاصلہ کو ختم اور دیوار کو ڈھانا ہوگا جو ان کے اور برادران وطن کے درمیان حائل ہوگئی ہے، خدمت اور فیض رسانی سے اس غلط فہمی اور بدگمانی کو دور کرنا ہوگا جو ابنائے وطن کے دلوں میں ان کی جانب سے پیدا ہوگئی ہے، بُعد و بیگانگی اور نفرت و اجنبیت کو قرب، یگانگت اور محبت و انسیت میں تبدیل کرنا ہوگا، فضول خرچی، اسراف، تکلف اور نمائش پسندی کے بجائے اصلیت، سادگی اور حقیقت پسندی کو اختیار کرنا ہوگا، ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو مقدم کرنا ہوگا، اجتماعی اور قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے طویل المیعاد منصوبے اور پروگرام بنانے ہوں گے جن کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے بڑے صبر و استقلال سے کام لینا اور اپنا خواب و خور حرام کرنا پڑیگا، یہ سارے کام بڑے صبر آزما، دقت طلب اور دیرپا ہیں مگر ان کے بغیر نہ مسلمان اپنی ملت کی مفید خدمت کر سکتے ہیں اور نہ ملک میں اپنی اچھی اور بہتر جگہ بنا سکتے ہیں، گردش ایام اور حکومت کی بے رخی کا شکوہ و گلہ کرنے، جذبات کی رو میں بہنے اور عمل سے فارغ ہوکر تقدیر کا بہانہ بنانے سے نہ ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ ملت کے مقدر کا ستارہ چمک سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ ۱۸ رمضان المبارک کو دارالمصنفین کے پرانے اور مخلص خدمت گذار مشہود ادیس صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ان کے والد مولوی محمد ادیس صاحب دارالمصنفین کے ابتدائی معماروں میں تھے، جو عرصہ تک اس کے دفتر اور پریس کے انچارج بھی رہے، مشہود ادیس بھی آخر دم تک دفتری کاموں کو انجام دیتے رہے، انتقال کے روز بھی دفتر آئے تھے، وہ بڑے خوش مزاج تھے، دوسروں کا کام کرکے خوش ہوتے، ان کی صحت برسوں سے خراب تھی دمہ کا عارضہ تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

مقالات

کچھ سعدی شیرازی کے بارے میں

از

پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ،

(چند سال ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے ایک سیمینار میں کلیدی خطبے کے طور پر پیش کیا گیا تھا)

ہندوستان صدیوں تک فارسی کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کی سرزمین میں اسکی بڑی آبیاری ہوئی، یہیں مختلف تہذیبوں کے زیر سایہ بڑھی، پلی اور پروان چڑھی، اس کے نتیجے میں ہندوستانی فارسی ادب میں بڑی توانائی پیدا ہوئی اور وہ نئے آب و رنگ کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا، جس کے خاص جوہر، وسعت، جاذبیت اور تنوع تھے، اس ملک میں فارسی زبان ایک مشترکہ تہذیب کے وجود میں لانے کا موجب بنی، یہاں تک کہ بتدریج ہندو تہذیب و علم کی اجارہ داری بھی اس کے حصے میں آگئی، اس طرح کہ اس مذہب کی تقریباً ساری اہم کتابیں فارسی میں منتقل ہوگئیں، ہندوستانی قصے کہانیوں نے بھی فارسی جامہ پہنا، ان میں فیضی کی مثنوی "نل دمن" کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، امیر خسرو کے کلام خصوصاً ان کی تاریخی مثنویوں پر ہندوستان کی گہری چھاپ ہے، اور

ہندوستانی تہذیب وتاریخ کے گہرے شعور کے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں داخلی شاعری بھی ہندوستانی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، کوئی غیر ملکی اس نفیس شعر کی داد نہیں دے سکتا۔

چون زن ہندو کسی در عاشقی مردانہ نیست — سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، اس کا دوسرا رخ اس سے زیادہ دلچسپ ہے فارسی زبان نے ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی تہذیب کو کافی متاثر کیا، اس لین دین میں ہندوستان میں ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آئی جس کا نقطۂ عروج ایک طرف تو اردو زبان وتہذیب ہے اور دوسری طرف تاج محل جیسی اعجوبۂ روزگار عمارت کی تکمیل ہے، اسی کا نتیجہ وہ مسلمان شاعر اور ادیب ہیں جنھوں نے ہندی زبان وادب و تہذیب کے پروان چڑھانے میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں، ان میں عبدالرحمٰن صاحب سندیش راسک ملا داؤد صاحب چنداین، ملک محمد جائسی صاحب پدماوت، عبدل دہلوی صاحب ابراہیم نامہ، حسن منجھو خلجی صاحب رتن کلیان، ابراہیم عادل شاہ صاحب نورس، دارا شکوہ صاحب سر اکبر و مجمع البحرین، عبدالرحیم خان خاناں، رسخان اور دوسرے شعرا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان میں ہر ایک کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔

ہندوستان نے فارسی زبان وادب کی ترقی میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، البتہ یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کا فارسی ادب کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ایران کے فارسی ادب کے نہ صرف ہم پلہ بلکہ بعض لحاظ سے زیادہ باوقیع ہو گیا تھا،

ہندوستان نے فارسی کی خدمت ایک لحاظ سے اور بھی کی ہے اسی ملک کے توسط

سے یہ زبان مشرق بعید میں روشناس ہوئی اور اس زبان کے اثرات اس خطے کے ممالک کی زبان وادب اور دوسرے معاشرتی وتمدنی امور پر بڑی حد تک نمایاں ہیں

اگرچہ ہندوستان فارسی زبان وتہذیب کا اعلیٰ درجے کا مرکز بن چکا تھا لیکن ایران اور دوسرے حصوں سے جہاں فارسی بولی جاتی تھی، اس کے علمی و فرہنگی روابط بہت استوار تھے، ان ممالک سے علماء فضلاء، شعراء وغیرہ کا قافلہ ہندوستان آتا اور یہاں کی علمی وادبی فضا کی رونق بڑھاتا، اس طرح اہل ہند ایران وغیرہ کی ادبی وشعری روایت سے باخبر رہتے، علی کوفی نے ناصرالدین قباچہ کے دربار میں سندھ کی عربی تاریخ کا فارسی میں ترجمہ چچ نامہ کے نام سے کیا تو اس کے مقدمے میں انوری کے ایک قصیدے کے ۸ شعر نقل کیے، انوری کی وفات ۵۸۷ھ بھی بتائی گئی ہے اس لحاظ سے ۶۱۳ھ تک (جس تاریخ میں چچ نامہ وجود میں آیا) ۲۶ سال ہوتے ہیں، اس قلیل مدت میں انوری کے اشعار ہندوستان میں عام ہو جاتے ہیں۔ سراجی خراسانی مجیر بیلقانی کی وفات ۵۸۶ھ کے چند ہی سال بعد اس کے متعدد قصائد کا جواب لکھا ہے، عمید لویکی التمش کے بیٹے ناصرالدین محمود کے زمانے کا شاعر ہے جس کا کلام راقم نے جمع کر کے شایع کیا ہے، اپنے ہم عصر ایرانی شاعر کمال اسماعیل کے ایک قصیدے کا جواب لکھا ہے،

عمید گفت بخاک جناب تو چو کمال — کجائی ای بدو لب آب زندگانی من

حافظ شیرازی کی حیات ہی میں ہندوستان میں ایک مجموعہ بنام مجموعہ لطایف وسفینہ ظرایف مرتب ہوا، اس میں حافظ کی ڈیڑھ سو سے زیادہ غزلیں منتخب ہوئیں، یہ حافظ کلام کا شاید سب سے قدیم ماخذ ہو، ان منتخب غزلوں میں ایک غزل ایسی ہے جو حافظ

کے دیوان کے کسی مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں شامل نہیں۔ وہ اس طرح شروع ہوتی ہے،

ای وصل جان نوازت معمار خانۂ دل — وای جان و دل ز لعلت مقصود کردہ حاصل

جب یہ غزل راقم نے انڈو ایرانیکا ستمبر ۱۹۶۶ء میں، اور پھر ماریہ بلقیس نے فکر و نظر میں شائع کی تو بعض ایرانی دوستوں نے اس کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا، لیکن اول یہ مجموعہ لطائف کے دونوں معلوم نسخوں میں شامل ہے، دوم اس میں ان کے ممدوح قطب الدین محمود شاہ کا نام آیا ہے اور محمود شاہ ۷۶۵ھ سے ۷۶۷ھ تک شاہ شجاع کو شکست دے کر شیراز کا بھی والی بن بیٹھا تھا، گویا وہ حافظ کا معاصر تھا ثالثاً یہ منظومہ حافظ کی ڈیڑھ سو سے زیادہ غزلوں کے ہمراہ آیا ہے، اس سے اتنی بات تو قطعی ہے کہ مرتب مجموعہ کو دیوان حافظ کا جو نسخہ ملا تھا اس میں یہ غزل شامل تھی۔ بہرحال اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہندوستان میں ایرانی فضلا و شعرا کی شہرت بہت ہی جلد عام ہو جاتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان اور ایران کے ادبی و تہذیبی روابط برقرار تھے جس کا بڑا ثبوت علما و فضلا کی آمد و رفت سے فراہم ہوتا ہے، سعدی شیرازی کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا اور نصف النہار تک پہنچا، اس کی روشنی سے ہندوستان بھی متاثر ہوا، سلطان بلبن کا بیٹا سلطان محمد شہید (م ۶۸۳ھ) اپنی عمر کے اواخر میں ملتان کا سربراہ تھا، وہ بڑا علم و شعر دوست تھا، امیر خسرو اور حسن دہلوی اس کے دربار سے وابستہ تھے، اس علم پرور شہزادے نے سعدی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے عذر کیا، بہرحال وہ اس وقت تو نہیں آئے البتہ بوستان میں لکھا ہے کہ وہ سومنات پہنچے تھے، اس روایت میں واقعات اتنے مشکوک ہیں کہ

سعدی کا پورا بیان مشتبہ ہو جاتا ہے۔ خیر سعدی ہندوستان آئے ہوں یا نہیں، ان کی شاعری کا غلغلہ ہندوستان کے کونے کونے میں تھا اور ان کی یہ شہرت ساتویں صدی کے اواخر سے لے کر آج تک بحالہ قائم ہے، اس کا اندازہ ان امور سے کیا جا سکتا ہے:

۱۔ سعدی کی کتابیں خصوصاً گلستان بوستان ہندوستان کے درسی نصاب میں کئی صدی سے شامل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔

۲۔ سعدی کے سیکڑوں مقولے و مصرعے ضرب الامثال کے طور پر زبان زد خاص و عام ہیں مثلاً

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود۔ زمین شور سنبل بر نیارد۔ لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش۔ آنانکہ غنی ترانند محتاج ترانند۔ ہر کجا چشمۂ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند۔ راستی موجب رضای خداست۔ آنرا کہ حساب پاکست از محاسبہ چہ باک۔ دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست۔ کہ آب حیوان درون تاریکی است۔ کہ صبر تلخ است ولیکن بر شیرین دارد۔ جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ۔ خطای بزرگان گرفتن خطاست سر مار کوفتہ بہ۔ جور استاد بہ ز مہر پدر۔ نہ محقق بود نہ دانشمند چارپائی برو کتابی چند۔ گربۂ مسکین اگر پر داشتی تخم گنجشک از جہان برداشتی وغیرہ وغیرہ

۳۔ سعدی کا کلام ہندوستان میں متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہوا، خصوصاً گلستان اور بوستان تو پچاسوں مرتبہ ہندوستان میں چھپی تھیں۔ ایران میں ان کا کلام اتنی کثرت سے طبع نہیں ہوا۔

۴۔ ان کے کلام کی متعدد شرحیں ہندوستان میں لکھی گئیں۔

۵۔ ان کے کلام کے ہزاروں مخطوطے ہندوستان کے کتابخانوں کی زینت ہیں۔

پاکستان میں ان کے مخطوطات پر ایک کتابچہ اور مطبوعات پر دوسرا کتابچہ شایع ہوا ہے مخطوطات تو صرف پاکستان کے کتابخانوں کے ہیں، ہندوستان میں ان سے کئی گنا زیادہ مخطوطات ہیں۔

۶۔ ہندوستان میں سعدی پر کافی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور حالی کی کتاب "حیات سعدی" تو سعدی شناسی کے سلسلے کی سب سے قدیم کوشش ہے،

سعدی شیرازی ایران کا سب سے زیادہ محبوب شاعر ہے، گویا بقول علامہ محمد قزوینی:

مطلوب کل طالب و محبوب و مرغوب کل راغب است

سعدی کی غیر معمولی مقبولیت کے اسباب چند در چند ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں

۱۔ سعدی کا کلام ان کی جہان بینی، ان کے دنیا بھر کے تجربات کا نچوڑ ہے،

۲۔ ان کی مقبول ترین کتابیں، گلستان اور بوستان ہیں، ان دونوں میں داستان کے ذریعے اخلاقی مضامین حکیمانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں، حکایات بذات خود دلچسپ ہوتی ہیں اور سعدی جیسے جہاں بیں اور سحر نگار کے قلم سے جب یہ لکھی جائیں تو ان میں بے پناہ جاذبیت پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

۳۔ سعدی فطرت کے بڑے رمز شناس تھے، اس پر ان کی نکتہ سنجی اور ندرت بیانی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، گلستان کی ایک بیت ہے:

تواضع ز گردن فرازان نکو است   گدا گر تواضع کند خوی اوست

بڑے مرتبے والے لوگ اگر تواضع کریں تو وہ زیادہ قابل توجہ ہے، فقیر کی عادت ہی تواضع کی ہوتی ہے اس لیے ان کی تواضع قابل قدر نہیں بالفاظ دیگر اس شخص کی ایمانداری قابل تعریف نہیں ہو سکتی جس کو بے ایمانی کا موقع ہی نہ ہو، ایمانداری صحیح معنوں میں اسی کی ہے جس کو بے ایمانی کا موقع ہو اور وہ اس موقع سے دستکش ہو جاتا ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"رازی کہ نہاں خواہی با کس در میان منہ اگر چہ دوست باشد کہ مر آن دوست را نیز دوستان باشند و ہمچنین مسلسل"

کہتا ہے کہ اگر راز کو راز رکھنا ہو تو دوست سے بھی اخفا بہتر ہے اس لیے کہ اس دوست کے بھی دوست ہوں گے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی نہ ختم ہوگا، ہمچنین مسلسل جیسے فقرے جو ایک طرف ایجاز و اختصار کے اعتبار سے اعجاز ہے تو دوسری طرف سعدی کی فطرت شناسی پر گواہ عادل۔

۴۔ سعدی کا طرز سادہ اور تکلف سے دور، ابہام اور تاریکی سے مبرا ہے، وہ ہمیشہ مستقیم راہ اختیار کرتے ہیں اور یہ طرز ان کی فطری سادگی کا نتیجہ ہے اور اس روش میں وہ رودکی اور فردوسی سے بہت قریب ہو جاتے ہیں، سعدی کی طرح یہ دونوں استعارہ اور صنائع کے بجائے جملہ کی ترکیب پر نظر رکھتے ہیں۔ سعدی کے کلام میں توانائی اور گیرائی کا راز اس میں ہے کہ وہ تصنع پر سادگی کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے یہاں تشبیہ و استعارہ کی چاشنی صرف اتنی ہے کہ اس سے ان کی سادگی بیان کو ٹھیس نہ لگے، یہاں ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

باگیسوی عروسان چمن شانہ کند   بوی نسرین و قرنفل ببرد در اقطار

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر   راست چون عارض گلگون عرق کردہ یار

یا

جہان بر آب نہادہ است و آدمی بر باد   غلام ہمت آنم کہ دل برو ننہاد

وجود عاریتی خانہ ایست بر رہ سیل   چراغ عمر نہادست بر دریچۂ باد

سعدی نے گلستان کے دیباچے میں سجع کا استعمال اس حد تک کیا ہے کہ اس

ان کی سادگی اور روانی کو ٹھیس نہ لگے، تو تھوڑے سے تکلف کے باوجود ان کی نثر ایسی رواں ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی اگر نکال دیا جائے تو لطف بیان جاتا رہتا ہے دیباچہ کے ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

ہر نفسی کہ فرو می رود ممد حیات است و چون بر می آید مفرح ذات پس در نفسی دو نعمت موجود و بر ہر نعمتی شکری واجب

از دست و زبان کہ بر آید کز عہدۂ شکرش بدر آید

یا مثلاً یہ عبارت

فراش باد صبا را گفتہ تا فرش زمردین بگسترد و دایۂ ابر بہاری را فرمودہ تا بنات نبات را در مہد زمین پرورد

۵۔ سعدی کے طرز کی ایک بڑی خوبی ایجاز ہے، وہ بڑے سے بڑے مفہوم کو چند لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان میں پیچیدہ بیانی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ یہ ایجاز طرز کی دلنشینی اور دلکشی کا موجب ہوتا ہے، اسی ایجاز کا نتیجہ ہے کہ ان کے سیکڑوں فقرے ضرب المثل ہو گئے ہیں، گلستان کا باب ہشتم جو آداب صحبت میں ہے، تمام کا تمام ایجاز بیانی کا اعلیٰ نمونہ ہے، ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

مال از بہر آسایش عمر است نہ عمر از بہر گرد کردن مال، عاقلی را پرسیدند نیک بخت کیست و بد بخت چیست، گفت نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بد بخت آنکہ مرد و ہشت

دو کس رنج بیہودہ بردند و سعی بی فایدہ کردند، یکی آنکہ اندوخت و نخورد و دیگری آنکہ آموخت و نکرد

علم از بہر دین پروردن است نہ از بہر دنیا خوردن

ملک از خردمندان جمال گیرد و دین از پرہیزگاران کمال یابد، پادشاہان بہ نصیحت خردمندان از آن محتاج ترند کہ خردمندان بقرب پادشاہان،

ہر سری کہ داری با دوست در میان منہ و اگر چہ دوست مخلص باشد چہ دانی کہ وقتی دشمن گردد و ہر گزندی کہ توانی بدشمن مرسان کہ باشد وقتی دوست گردد،

نصیحت از دشمن پذیرفتن خطاست و لیکن شنیدن رواست تا بخلاف آن کار کنی کہ عین صواب است،

ہر کس کہ بیع را بکشد خلق از بلای او برہاند و وی را از عذاب خدای، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید،

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

۶۔ سعدی کا کلام سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے، یعنی اگرچہ وہ سادہ ہوتا ہے لیکن اس میں ایسی طرفگی اور پرکاری ہوتی ہے کہ اس کی تقلید ناممکن ہو جاتی ہے، گلستان، بوستان، غزلیات کے علاوہ ان کے بعض قصائد تک میں یہ وصف درجۂ کمال تک پہنچا ہوا ہے۔

۷۔ سعدی کے کلام کی دلآویزی کے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ ہے ان کے نزدیک صرف انسان کی سرگزشت نکتہ آموز نہیں، بلکہ حیوان اور بے جان چیزوں میں درس عبرت موجود ہے، وہ کبھی انسانوں کی زبان سے، کبھی جانوروں کی اور کبھی بے جان چیزوں کے واسطے سے حقیقت کی پردہ کشائی کرتے اور اعلیٰ درجے کا درس اخلاق دیتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یکی قطرۂ باران ز ابرے چکید خجل شد چو پہنای دریا بدید

کہ جائی کہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

چو خود را بچشم حقارت بدید صدف در کنارش بجان پرورید

سپہرش بجائی رسانید کار کہ شد نامور لولوی شاہوار

بلندی ازان یافت کو پست شد در نیستی کوفت تا ہست شد

تواضع کند ہوشمند گزیں نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمین

قطرے نے سمندر کے مقابلے میں اپنے کو حقیر سمجھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدف نے اسکی پرورش کی اور بالآخر وہ در شاہوار ہوا، فروتنی اور تواضع کا نتیجہ نہایت شاندار ہوتا ہے آخر میں نہایت عمدہ تمثیل ہے، پھلدار شاخ ہی تو جھکتی ہے، آخری مصرعے کی روانی قابل داد ہے، اس کی وجہ سے یہ ضرب المثل ہو گیا ہے،

شمع و پروانہ کے مکالمے کے ذریعے سعدی نے جو درس عبرت سکھا اور ہم تک پہنچایا ہے اس سے ان کی نکتہ رس طبیعت کا پتہ چلتا ہے، یہ اشعار ایک طرف تو اعلےٰ درجے کے مطالب سے ہمکنار ہیں تو دوسری طرف اپنی سادگی اور پرکاری کی وجہ سے سہل ممتنع کی بہترین مثال ہیں:

شبی یاد دارم کہ چشمم نخفت شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

کہ من عاشقم گر بسوزم رواست ترا گریہ و سوز باری چراست

بگفت ای ہوادار مسکیں من برفت انگبین یار شیرین من

چو شیرینی از من بدر میرود چو فرہادم آتش بسر می رود

ہمی گفت ہر لحظہ سیلاب درد فروی دویدش بر خسار زرد

کہ ای مدعی عشق کار تو نیست کہ نہ صبر داری نہ یارای ایست

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام من استادہ ام تا بسوزم تمام

گلستان کی منظوم حکایت جو تاثیر صحبت سے متعلق ہے اور مٹی کی زبان سے سنائی گئی ہے، کیسی پر تاثیر ہے:

گلی خوشبوی در حمام روزی رسید از دست محبوبی بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوی دل آویز تو مستم

بگفتا من گلی ناچیز بودم ولیکن مدتی با گل نشستم

جمال ہمنشین در من اثر کرد وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

۸۔ سعدی کا کلام اپنے موضوع اور اپنے طرز نگارش دونوں کے اعتبار سے اپنے دور کے خلاف ایک ردِ عمل کی صورت میں سامنے آیا، مداحی جھوٹی کا رنگ اختیار کر چکی تھی، مبالغہ تبلیغ سے بڑھ کر اغراق کی انتہا تک پہنچ چکا تھا، ظہیر فاریابی جس کی قصیدہ گوئی کافی شہرت رکھتی ہے، اس نے قزل ارسلان کی تعریف میں جتنا غلو کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے، کہتا ہے

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پای تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہم

سعدی جیسا آزاد منش کے لیے یہ بیان نا قابل برداشت تھا چنانچہ جواں بخت سعد[1] ابوبکر بن سعد کو خطاب کر کے کہتا ہے،

براہ تکلف مرو سعدیا اگر صدق داری بیار و بیا

---

[1] یہ سلغری خاندان کا چھٹا حکمراں تھا جو ۶۵۸ھ میں تخت نشین اور اسی سال جوان العمری میں پیمانۂ مرگ نوش کیا۔

تو منزل شناسی و شہ راہرو — تو حق گوی و خسرو حقایق شنو

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان — نہی زیر پای قزل ارسلان

بگو پای عزت بر افلاک نہ — بگو روی اخلاص بر خاک نہ

بطاعت بنہ چہرہ بر آستان — کہ اینست سر جادۂ راستان

کیا اس دور میں کسی شاعر کی مجال تھی کہ اپنے کو منزل شناس اور ممدوح رہ رو قرار دے لیکن سعدی کی حق گوئی مشہور تھی، اسی کا تقاضا تھا کہ وہ تکبر کی ممانعت اور فروتنی کی نصیحت کرتے ہیں، حق گوئی اپنی صفت اور حق شنوی سلطان کی صفت کا بیان جس بلیغ انداز میں کیا وہ سخن فہم پر پوشیدہ نہیں، یہ اشعار سادگی اور سہل ممتنع کی بہترین مثال ہیں۔

اتابک ابوبکر بن سعد (۶۲۳ تا ۶۵۸ھ) کو تواضع کا درس دیتا ہے اور انداز بیان کیسا بلیغ ہے۔

کلہ گوشہ بر آسمان برین — ہنوز از تواضع سرش بر زمین

ز گردن فرازان تواضع نکوست — گدا گر تواضع کند خوی اوست

غم از گردش روزگارش مباد — وز اندیشہ بر دل غبارش مباد

اگر بر خاطر پادشاہان غمی — پریشان کند خاطر عالمی

دل و کشورت جمع و معمور باد — ز ملکت پراگندگی دور باد

پہلے شعر میں تضاد کی کیفیت پیدا کر کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، فطرت کا رمز شناس شاعر ممدوح کے بلند مرتبہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ بلندی کے اعتبار سے وہ آسمان برین تک پہنچتا ہے لیکن خاکساری کا یہ عالم ہے کہ زمین سے اس کا سر اٹھتا ہی نہیں، یہ انداز بیان بس سعدی جیسے شاعر کا حصہ ہے، دوسری بیت ضرب المثل ہے

چوتھے شعر میں بادشاہ اور رعیت کے درجے کا تعین کرتا ہے، آخر میں ہے بادشاہ کی اطمینان خاطر ملک کی معموری کا سبب ہوتا ہے،

۹۔ سعدی ایسے عالم کے خواہاں ہیں جس کی بنیاد عدل و داد گستری، نگہداشت خلق، ان کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ اخلاق حسنہ پر ہو، وہ ایسے حکمران کو پسند کرتے ہیں جو خدمت خلق کو اپنا مقصود اور رعیت کی حفاظت کو اپنا مطلوب قرار دیتا ہے اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہ خاطر نگہدار درویش باش — نہ در بند آسایش خویش باش

نیاید بنزدیک دانا پسند — شبان خفتہ و گرگ در گوسفند

رعیت چو بیخند و سلطان درخت — درخت ای پسر باشد از بیخ سخت

مکن تا توانی دل خلق ریش — وگر میکنی می کنی بیخ خویش

کسی زین میان گوی دولت ربود — کہ در بند آسایش خلق بود

آج سے تقریباً [illegible] سال قبل سعدی نے سب سے زیادہ اہمیت رعیت کو دی ہے، وہ جڑ ہیں، اور جڑ سے درخت مضبوط ہوتا ہے، عوام پر ظلم حکومت کی بیخ کنی کے مترادف ہے اس سے بہتر حکومت کا کیا اصول ہو سکتا ہے، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ سعدی کے یہاں دور جدید کے سیاسی سماجی اور اخلاقی مسائل کا حل موجود ہے، اسی طرح کے خیالات سعدی کی بالغ نظری کی دلیل ہیں اور موجودہ دور میں ان کے کلام کی عظمت اور مطالعے کی ضرورت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، وہ ظالم حکمرانوں کو خدا کا باغی قرار دیتے ہیں، اور دنیا اور آخرت دونوں کی رسوائی کی مثال بتلاتے ہیں، ظالم فرمانروا کی دعا اس وقت تک قبول نہیں ہو سکتی جب تک وہ مظلوموں کی حمایت نہ کرے، سعدی بوستان میں

لکھتے ہیں:

دعای منت کی خود سود مند | اسیران محتاج در چاہ بند
ببایست عذر خطا خواستن | پس از شیخ صالح دعا خواستن

حسب ذیل اشعار ایک طرف سعدی کی حق گوئی اور بے باکی کی بہترین مثال ہیں تو دوسری طرف اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حریص ان ملکی صفات سے دور ہوتا ہے وہ سارے اہل قلم کو حق گوئی کی دعوت دیتے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ابھارتے ہیں، ملاحظہ ہو:

دلیر آمدی سعدیا در سخن | چو تیغت بدست است فتحی بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ | نہ رشوت ستانی و نہ عشوہ دہ
طمع بند و دفتر ز حکمت بشوی | طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگوی

یہ تو مثنوی کا حال ہے جو اس طرح کے درس سے پُر ہے، ان کے قصیدے بھی اعلیٰ درجے کے خیالات سے مملو ہیں ان میں جو اخلاقی درس دیا گیا ہے اس سے سعدی کی آزادیٔ فکر، بے باکی اور جوانمردی کا بخوبی ثبوت فراہم ہوتا ہے، ممدوح کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے بجائے اس کو سود مند نصائح دیتے ہیں، وہ ممدوح کے رعب و دبدبے، جاہ و جلال سے مطلق مرعوب نہیں ہوتے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کو کسی قسم کا لالچ نہیں، اس لیے جو کچھ لکھتے ہیں تو بر بنائے مصالح ملک و ملت لکھتے ہیں، وہ بڑے درجے کے معلم اخلاق کے ساتھ ساتھ مصلح قوم و ملت تھے اور چونکہ وہ معجز نگار اور فطرت کے رمز شناس تھے اس لیے ان کے کلام میں بے پناہ تاثیر ہے،

مومنین اعظم کو ایک قصیدہ میں اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

بس بگردید و بگردد روزگار | دل بدنیا در نہ بندد ہوشیار
ایکہ وقتی نطفہ بودی در شکم | وقت دیگر طفل بودی شیرخوار
ہمچنین تا مرد نام آور شدی | فارس میدان و مرد کارزار
انچہ دیدی برقرار خود نماند | وانچہ بینی ہم نماند برقرار
دیر و زود این شخص و شکل نازنین | خاک خواہد گشت و خاکش غبار
اینہمہ ہیچست چون می بگذرد | تخت و بخت و امر و نہی و گیر و دار
نام نیکو گر بماند ز آدمی | بہ کزو ماند سرای زرنگار
سعدیا چندانکہ می دانی بگو | حق نشاید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در کار نیست | از خطا باکش نباشد وز تتار

۱۰۔ سعدی کے یہاں بشر دوستی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں، وہ انسانوں میں قوم، مذہب و نسل کی بنیاد پر کسی تفریق کے قائل نہیں، بلکہ آدمیوں پر شفقت و مروت کے ساتھ جانوروں کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا انسانیت کی دلیل بتلاتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار میں واضح کیا گیا ہے کہ جب خدا اس شخص کے گناہ معاف کر دیتا ہے جو کسی پیاسے کتے کو راہ میں پانی پلا دیتا ہے تو انسان کے ساتھ اس کا سلوک کیوں ضایع جائے گا۔

یکی در بیابان سگی تشنہ یافت | برون از رمق در حیاتش نیافت
کلہ دلو کرد آن پسندیدہ کیش | چو حبل اندران بست دستار خویش
بخدمت میان بست و بازو گشاد | سگ ناتوان را دمی آب داد

خبر داد پیغمبر از حال مرد — که داور گناہان از و عفو کرد
الا گر جفا کاری اندیشہ کن — وفا پیشہ گیر و کرم پیشہ کن
کسی با سگی نیکوئی گم نکرد — کجا گم شود خیر با نیک مرد

حضرت ابراہیم خلیلؑ بغیر کسی مہمان کے کھانا نہ کھاتے ایک روز ایک شخص ان کا مہمان ہوا، اتفاق سے وہ مجوسی نکلا تو اس کو کھانا نہ کھلایا، خدا نے اس عمل پر ان کو ملامت کی :۔

شنیدم کہ یک ہفتہ ابن السبیل — نیامد مہمان سرای خلیل
بدانست پیغمبر نیک فال — کہ گبر است پیری تہ تودہ حال
بخواری براندش چو بیگانہ دید — کہ منکر بود پیش پاکان پلید
سروش آمد از کردگار جلیل — بہیبت ملامت کناں کای خلیل
منش دادہ صد سال روزی و جان — ترا نفرت آمد از و یکزمان
گر او می برد پیش آتش سجود — تو وا پس چرا می بری دست جود

سعدی ایک ایسے عالم کی تشکیل کے خواہاں تھے جس میں سارے انسان جسم کے اعضا کی طرح رہیں اور دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریک :

بنی آدم اعضای یکدیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بی غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

سعدی کے اخلاقی اصول میں خلق خدا کی خدمت کی سب سے زیادہ اہمیت تھی، وہ زہد پر خلق خدا کی خدمت کو مقدم رکھتے تھے، سعدی کے عہد پر نظر رکھیے اور

اس شعر کو پڑھیے ،

عبادت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

بوستان کی وہ حکایت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اقصائے روم میں ایک بڑی پاکیزہ طبیعت کے زاہد رہتے تھے، سعدی کہتے ہیں کہ میں چند سیاحوں کے ساتھ ان کی ملاقات کی غرض سے پہنچا، انھوں نے نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا، سر اور ہاتھ اور آنکھ کا بوسہ لیا اور بڑی دلجوئی سے ہماری حالت دریافت کی لیکن کھانے کو نہ پوچھا، رات ہوگئی، وہ ساری رات تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے، مطلق نہ سوئے اور ہم لوگ بھی بھوک سے نہ سو سکے۔ صبح ہوئی، پھر وہی زبانی تعظیم و تکریم شروع کی، ہم میں سے ایک خوش طبع اور شوخ تھا، ان بزرگ کے عمل کو دیکھ کر کہا :

مرا بوسہ گفتا بہ تصحیف دہ — کہ درویش را توشہ از بوسہ بہ

تعظیم کی خاطر ہمارا جوتا نہ چھوئیے، روٹی دیجئے چاہے جوتا سر پر رکھ دیجئے، ایثار میں کامیابی ہے عابد شب زندہ دار کا دل مردہ ہے، بزرگی خیرات اور روٹی دینے میں ہے، بیہودہ بات خالی ڈھول ہے، قیامت میں وہی بہشت کا مستحق ہوگا جس نے بے بنیاد دعوی چھوڑ کر حقیقت کی تلاش کی۔

سعدی کا کلام انہی زریں اصولوں سے بھرا پڑا ہے۔

۱۱۔ سعدی غزل کے بادشاہ تھے، ان کی غزلیں جذبے کی گرمی، فطرت نگاری سادگی و صفائی، طرز ادا کی جدت وغیرہ خصائص سے متصف ہیں، غزل عموماً طبائع کو زیادہ مرغوب ہوتی ہے اور سعدی کی غزلیں جو اعلیٰ درجے کی خوبیوں کی حامل ہیں، نہایت مقبول ہوئیں،

(باقی)

تکملۂ تفسیر فتح العزیز

از: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء — لکھنؤ

سرزمین ہند میں یوں تو بے شمار علماء، فقہاء نیز اصحاب درس وافتاء اور ارباب سیف وقلم پیدا ہوئے مگر ہندوستان کی پوری علمی تاریخ میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) اور ان کی اولاد و احفاد کو جو امتیاز حاصل ہوا نیز ان کے ذریعہ جتنا اور جیسا فیض پہنچا وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آسکا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا پورا خاندان ہی "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا سچ مچ مصداق ہے لیکن ان میں موصوف کے فرزند اکبر حضرت مولانا شاہ عبد العزیز (م ۱۲۳۹ھ) قدس سرہ العزیز کی حیثیت بلاشبہ ستاروں میں آفتاب کی سی ہے، نہ صرف اس لیے کہ اسی چراغ سے خانوادۂ ولی اللّٰہی کے تمام چراغ روشن ہوئے بلکہ اسی سراج منیر سے پورے ہندوستان میں علم بالخصوص علم حدیث کا چراغاں ہوا، شاید اسی بنا پر انہیں "سراج الہند" کا لقب دیا گیا، شاہ صاحب موصوف کو تمام علوم متداولہ میں مہارت تامہ اور کامل دستگاہ حاصل تھی، جن کا دائرہ تاریخ و تذکرہ سے لے کر ریاضی و علم ہیئت تک پھیلا ہوا تھا، مگر فقہ و تفسیر میں تو انہیں وہ امتیاز حاصل تھا کہ قدیم علماء میں بھی ان کے ہم پلہ چند ہی

گذرے ہوں گے، معاصرین یا بعد کے علماء میں ان کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے،

تفسیر فتح العزیز

لیکن یہ تقدیری بات ہے کہ ان دونوں موضوع پر شاہ صاحبؒ کا تحریری ذخیرہ بہت کم ملتا ہے، تفسیر کی صرف تین جلدیں ملتی ہیں (جن میں سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل) پہلی جلد ناتمام اور دوسری و تیسری جلد سورۃ الملک سے لے کر تا آخر قرآن مجید ہے، اس تفسیر کے بارے میں، ہندوستان کے ممتاز عالم اور علماء کے تذکروں کا خصوصی ذوق اور ان پر وسیع نظر رکھنے والے محقق مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

"تفسیر قرآن مسمی بہ "فتح العزیز" جسے آپ نے (شاہ عبد العزیزؒ نے) شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املا کرایا تھا، یہ کئی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں"[1]

[1] ہنگامہ میں بڑا حصہ ضائع ہو جانے کا ایک قرینہ یہ ہے کہ پہلی جلد کا جو مطبوعہ شکل میں ملتی ہے اختتام ایک ناتمام قصہ بلکہ ناتمام جملہ پر ہوتا ہے اور وہ اس طرح ہے: "در ترمذی . . . . . و دیگر کتب معتبرہ حدیث از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ حق تعالیٰ حضرت یحییٰ پیغمبر را پانچ چیز حکم فرمودہ بود کہ خود ہم بداں عمل نماید و بنی اسرائیل را نیز بفرماید تا موافق آں عمل کنند حضرت یحییٰ علیہ السلام بنا بر تمرد بنی اسرائیل در اظہار آں احکام توقف فرمودند حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰ بگوئید کہ حق تعالیٰ شما را" اسی پر تفسیر فتح العزیز کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے اس قصہ کا بقیہ حصہ تفسیر فتح العزیز کے "تکملہ" میں دوسرے نمبر کے قصہ کے تحت اس طرح ہے: "(خدای تعالیٰ شما را) امر کردہ بود بہ پنج چیز کہ خود عمل نمائید و ہم بنی اسرائیل فرمائید پس یا خود برسانید یا من با شما امر کنم یحییٰ گفت اندیشہ ناکم مبادا بر من سبقت کنی و من بسبب درنگی کہ واقع شد بزمین . . . . (کرم خوردہ) فرو روم یا بعذابی دیگر سخت تر مبتلا گردم پس بلا مہلت یحییٰ علیہ السلام مردم را بیت المقدس جمع نمود چوں

اسی کے بارے میں ایک دوسری جگہ موصوف یہ لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ صاحبؒ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ تفسیر فتح العزیز کی شکل میں ہے جسے تفسیر عزیزی اور بستان التفاسیر کا نام بھی دیا گیا ہے، یہ شاہ صاحبؒ کی باقاعدہ املائی ہوئی مستقل تصنیف ہے، خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق وہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ، پھر سورۃ الملک سے آخر قرآن تک ہے لیکن سورہ بقرہ مکمل نہیں ہو سکی۔ جس کے اسباب معلوم نہیں ہو سکے۔ صرف ربع پارۂ دوم کے قریب تک آیت "وان تصبروا خیر لکم" تک طبع ہو سکی۔ کتاب تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لیکر پارۂ دوم کے ربع کے قریب تک، دوسری جلد سورۃ الملک (انتیسویں[29] پارے) سے لے کر سورۃ المرسلات تک ہے، تیسری جلد سورۂ عم یتساءلون (سورہ نبأ) سے شروع ہو کر آخر قرآن تک"[1]

شاہ صاحبؒ کی تفسیر کا اصلی رنگ تو منقول تفسیروں والا ہے، لیکن جگہ جگہ ان کی مجتہدانہ اور محققانہ خصوصیات بھی نمایاں نظر آتی ہیں جن کی وجہ سے اسے ایک ایسا امتیاز حاصل ہو گیا جو معاصر بلکہ قبل و بعد کی بھی بہت سی تفسیروں کو نہیں حاصل ہو سکا، اس بناپر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو گئی ہوتی یا مکمل محفوظ رہ جاتی تو دوسری تفسیروں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۳) بنی اسرائیل خاطر آمد و برجائے بلند نشستند یحیٰ گفت کہ خدای عزوجل امر نمود بہ پنج کلمہ کہ عمل نمایم بآں و شما را نیز با مور ساختہ اس کے بعد ان پنج کلمہ (یا پنج احکام) کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:۔ (۱) توحید، (۲) نماز، (۳) روزہ، (۴) صدقہ (۵) ہر حال میں خدا کو یاد رکھنا،

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص ۳۵۳ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ پہلا ایڈیشن [1] ایضاً ص ۳۵۰۔

سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیتی، اس کے نامکمل رہ جانے یا بڑے حصہ کے ضایع ہو جانے کی وجہ سے جو خلا محسوس ہوتا ہے بعید نہیں کہ اسے پر کرنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہوں، مگر ہمارے سامنے ایک ہی کوشش وہ بھی نا تمام آسکی ہے، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ایک شاگرد، مولانا حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) نے کی۔

صاحب تکملۂ فتح العزیز کا مختصر حال — مولانا حیدر علی موصوف کا تذکرہ ہندوستان کے رجال علم و فکر کی مشہور تاریخ "نزہۃ الخواطر" میں اس طرح ملتا ہے:

حیدر علی بن محمد حسن بن محمد	حیدر علی بن محمد حسن بن محمد ذاکر بن عبدالقادرؒ
ذاکر بن عبد القادر الدهلوی	دہلوی پھر فیض آبادی نے پہلے فیض آباد کے
ثم الفیض آبادی، قرأ العلم	شیعہ علماء سے پڑھا اس کے بعد دہلی جا کر
... من علماء الشیعۃ بفیض	شیخ رفیع الدین سے، اور شیخ عبدالعزیز
آباد، ثم سافر دهلی و أخذ	کے پاس لمبے عرصہ تک ٹھہر کر بڑا فیض اٹھایا،
عن ... الشیخ رفیع الدین	یہانتک کہ وہ بہت سے علوم میں ماہر
واستفاض عن الشیخ عبد العزیز	بن گئے پھر لکھنؤ آئے اس کے بعد بھوپال
وکان زمنہ زمانا حتی برع فی	پھر حیدرآباد چلے گئے وہاں نواب نے
کثیر من العلوم، ثم قدم	قاضی بنا دیا اسی کے ساتھ وہ تصنیف
لکھنؤ .... ثم سافر إلی بھوپال	و تالیف میں بھی لگے رہے ۱۲۹۹ھ میں
.... ثم إلی حیدرآباد فولاه	وفات ہوئی۔
نواب مختار الملک العدل القضاء	
.... مع اشتغاله بالتصنیف	

والتالیف ..... دمات ۱۲۹۵ھ[۱]

تکملہ کا محرک | تفسیر فتح العزیز کے تکملہ کی خدمت والیۂ بھوپال نواب سکندر بیگم کے ایماء پر انجام دی جیسا کہ اسی کتاب "نزہۃ الخواطر" میں ہے "ولہ تکملۃ "فتح العزیز" فی مجلدات کبار، صنفہا بأمر نواب سکندر بیگم ملکۃ بھوپال"[۲]

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ۔ صاحب "مقالات طریقت" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "مولوی حیدر علی صاحب" منتہی الکلام" نے حسب خواہش سکندر بیگم والیۂ بھوپال تفسیر "فتح العزیز" کا تکملہ ستائیس[۲] جلدوں میں کیا، راقم نے دیکھا ہے"[۳]

تکملہ فتح العزیز کا باقی ماندہ حصہ | لیکن اسے بھی قسمت کی ستم ظریفی کہا جائے یا کچھ اور؟ کہ تکملۂ فتح العزیز کا بھی اصل فتح العزیز کی طرح اکثر حصہ زمانہ کی دستبرد سے غالباً محفوظ نہ رہ سکا، بس اس کی ستائیس[۲] جلدوں میں سے۔ چار[۲] جلدیں ہی ندوۃ العلماء کے کتبخانہ میں (مخطوطات کے شعبہ میں) محفوظ ہیں، انہی کا تعارف۔ ذیل کی سطروں میں کرانا مقصود ہے،

پہلی جلد = سورہ بقرہ کی آیت "وان تصوموا خیر لکم" کی تفسیر سے شروع

---

۱ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۴-۵۵ (مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) ۲ ایضاً ج ۷ ص ۱۵۵ ۳ "مقالات طریقت" بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ پنجم ص ۳۵۰ یہ غالباً "مقالات" کی ہی ہے (مولانا علی میاں صاحب کی نہیں ہے) اور صاحب مقالات ہی کا دیکھنا یہاں مراد ہے۔ ع اس کا بھی امکان ہے کہ مولانا حیدر علی موصوف کو اپنے استاذ کے ناتمام کام کے پورا کرنے کا خیال از خود ہوا ہو مگر وسائل کی قلت یا فقدان کی وجہ سے اس کی ہمت نہ کر سکے ہوں، لیکن جب اس کام کا ایماء نواب سکندر بیگم (والیۂ بھوپال) کی طرف سے ہوا تو اسے بخیر و خوبی انجام دیا۔

ہو کر دوسرے پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے،

دوسری جلد = تیسرے پارے کے شروع سے لے کر تیسرے ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے،

تیسری جلد = چوتھے پارے کے شروع سے لے کر چوتھے ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے،

چوتھی جلد = پانچویں پارے کے شروع سے لیکر پانچویں ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس تفصیل سے یہ دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے ہر جلد ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں مکرر ہے، یعنی ہر ایک کے دو دو قلمی نسخے ہیں۔ ایک ہی نسخے کی چاروں جلدوں کے مجموعی اوراق کی تعداد ۱۵۵۰ یعنی ۳۱۰۰ صفحات ہوتی ہے اور صفحات کا سائز بھی اتنا بڑا ہے کہ آج کوئی بھی کتاب بجز حدیث و فقہ کی بعض نصابی کتابوں کے اتنے بڑے سائز پر غالباً طبع نہیں ہوتی۔

پہلی جلد۔ جس کے کتبخانہ کے رجسٹر کے مطابق (خاص) نمبرات ۱۴، ۲۸ ہیں؛ اسکے بارے میں کچھ تفصیلات:۔ کتبخانہ کا نمبر ۲۸ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

"کہ گفت[۱] بسفر دریا بارادہ حجاز در کشتی سوار بودیم کہ ناگاہ منادی آواز برزد کہ اہل کشتی درنگ کنید کہ باری خبر دہیم"

---

۱ قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا (کیونکہ یہ آغاز بتا رہا ہے) کہ اس سے قبل کچھ عبارت اور ہوگی جو محفوظ نہیں رہ سکی۔ زیر نظر عبارت میں بھی ایک واقعہ بیان ہوا (جسکا ابتدائی حصہ یہاں مذکور نہیں ہوا یا محفوظ نہیں رہ سکا) جو اصل تفسیر فتح العزیز میں۔ آخری واقعہ سے پہلے پورا موجود ہے تفسیر فتح العزیز کی پہلی جلد کا آخری واقعہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے، زیر نظر واقعہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

کتبخانہ کے ۳۸ء، پہلی جلد کے اختتام کی عبارت ملاحظہ ہو

"انبیاء و رسل کہ باوج کمال رسیدہ و بغایت شرف و بزرگی نامزد گردیدہ اند آنہا

نیز مدارج خویش اختلاف دارند"

کل اوراق ۳۴۴ — سائز ۳۰ × ۱۹ (حوض کا سائز = ۲۴ × ۶ء۱۲)

نوٹ :- ہر جگہ سائز کی پیمائش سنٹی میٹر (C.M.) میں دی گئی ہے،

ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں، کتابت بخط فارسی سیاہ روشنائی سے، ہر صفحہ پر تین لائن کا

باڈر جس میں دو لائن سرخ روشنائی سے اور ایک سیاہ سے،

کتب خانہ کے ۱۴، پہلی جلد کا آغاز ۳۸ء کی ہی طرح ہے مگر اختتام یہ ہے

"تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے)

آں پیغمبراں کہ حال شاں سمت ذکر یافت بزرگی دادیم و فضیلت نہادیم جمیعی از

ایشاں را بفضائل و کمالات علی بعض (بخط نسخ، سرخ روشنائی) بحجہ دیگر منھم من آیاتنا

بخط نسخ سرخ روشنائی سے، تفسیر بخط فارسی،

کل اوراق ۳۴۴ سائز = ۲۹ × ۱۷ (حوض کا سائز ۴ء۲۳ × ۱۲) ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں اور تین لائنوں کا باڈر جن میں دو سرخ اور ایک سیاہ،

دیگر خصوصیات :- تفسیر کا خط فارسی عمدہ، کاغذ بادامی، دبیز، اچھی حالت میں،

پیشانی پر مہر {محمد جمال الدین / خان مدار المہام} حاشیہ پر لکھا ہے "تکملہ تفسیر فتح العزیز پارہ سیقول

از مولوی حیدر علی" (نیلی روشنائی سے)

کچھ قابل ذکر باتیں (۱) اصل تفسیر فتح العزیز کی پہلی جلد کا اختتام ناقص جملہ پر ہوا ہے،

آیت "ان تصوموا خیر لکم" کی تفسیر میں فضائل روزہ کی روایات کے ضمن میں حضرت

یحییٰ سے متعلق ایک حدیث نبویؐ بیان کرتے ہوئے یہ روایت اصل تفسیر میں ذکر کی گئی ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰ بگو بیند کہ حق تعالیٰ شما را"

بس یہیں فتح العزیز کی پہلی جلد (مطبوعہ) ختم ہو جاتی ہے۔ تکملہ میں یہ واقعہ دوسرے نمبر کی روایت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تکملہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس میں ایک اور حدیث نبویؐ کے حوالہ سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو اصل تفسیر فتح العزیز میں، مذکورہ بالا ناقص واقعہ سے پہلے مذکور ہے، لیکن اس تکرار کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی[1]، مزید برآں یہ کہ "تکملہ" میں سب سے پہلے جو واقعہ حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے مذکور ہے وہ شروع سے ناقص معلوم ہوتا ہے، اس کا کچھ ابتدائی حصہ یقیناً رہ گیا ہے[2] معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں

---

[1] اسکی پوری تفصیل پہلے ہی حاشیہ میں گذر چکی ہے، تکرار کی ایک امکانی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صاحب تکملہ کو تفسیر فتح العزیز کا وہ نسخہ ملا ہو جس میں وہ پہلا واقعہ ہی ناتمام مذکور تھا جسکے بعد پھر دوسری جلد کا مسودہ شروع ہو جاتا ہے۔

[2] "تکملہ" میں اس واقعہ کا آخری حصہ اصل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ "ایسی شدید گرمی میں بھی جبکہ لوگ اپنی زندگیوں سے عاجز ہوتے، حضرت یحییٰ علیہ السلام روزہ رکھتے۔"

[3] اصل تفسیر جلد اول میں یہ واقعہ اسطرح ملتا ہے :- "آں حضرت صلعم ابو موسیٰ را برائے کار فرستادہ بودند ابو موسیٰؓ در عین دریا در جہاز سوار بود و شب تاریک ناگاہ ابو موسیٰ و یاران او صدائے از آسمان شنیدند کہ میگوید باشید تا شما را از حکم خدا خبر دہم و از عہداو تعالیٰ کہ بر خود لازم فرمودہ است آگاہ کنم ابو موسیٰ برخاست و گفت اے عزیز باد موافق وزد و شراع کشتی را برد نشستہ ایم و در عین دریا یم قسم تو قف کنیم و ترا حاجت تو قف چیست ہر چہ میخواہی بگو کہ ما بجان و دل می شنویم صدا آمد کہ حق تعالیٰ بر ذات پاک خود چنیں لازم فرمودہ است کہ ہر کہ خود را برای رضای او روز گرم تشنہ دارد او را تشنگی روز قیامت امان دہد۔"

واقعات سیوطیؒ کی مشہور تفسیر درمنثور سے لیے گئے ہیں کیونکہ اس میں بھی یہ دونوں اسی آیت کے تحت مذکور ہیں،

(۲) م۱۲ کی پیشانی پر مہر ہے، م۳۰ پر نہیں ہے،

(۳) م۱۲ کا اختتام تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض ..... الخ پر ہوتا ہے، لیکن م۳۰ کا اختتام "انبیاء و رسل کہ باوج کمال رسیدہ ..... الخ" پر ہوتا ہے تکملہ کی دوسری جلد کتبخانہ کا خاص م۱۵، ۳۰) کے بارے میں بعض معلومات :-

م۱۵، ۳۰ دوسری جلد کا آغاز :

"تلک الرسل فضلنا بعضھم (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے) آں پیغمبراں کہ حال شاں سمت ذکر یافت بزرگی دادیم (بخط فارسی، سیاہ روشنائی سے)"

دوسری جلد کا اختتام

"والحمد للہ علی ذلک حمداً کثیراً (بخط فارسی، سیاہ روشنائی)"

م۱۵ کے کل اوراق = ۳۰۴ } ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں
م۳۰ کے کل اوراق = ۴۲۱ }

م۱۵ کا سائز = ۲۹×۱۷،۱۱ (حوض کا سائز = ۲۴×۱۲) پہلے صفحہ کے بائیں طرف لکھا ہے:

"تکملۂ تفسیر فتح العزیز پارۂ تلک الرسل از مولوی حیدر علی صاحب"

م۳۰ کا سائز = ۲۸×۱۷،۵ (حوض کا سائز = ۲۴×۱۲) م۳۰ کے شروع میں دو مہریں تھوڑے فصل سے [خان مدار المہام] مہر کا اوپر کا حصہ کٹ گیا،

قابل ذکر امور | م۱۵ جگہ جگہ سے کرم خوردہ، آیات سرخ روشنائی سے اور حدیث

کی اکثر کتابوں کے نام بطور حوالہ بھی سرخ روشنائی سے، دونوں نسخے (م۱۵، م۳۰) تقریباً یکساں ہیں البتہ م۳۰ کا خط کچھ اور بہتر ہے، اگرچہ دونوں کے خط فارسی اچھے ہیں، دونوں میں سرخ روشنائی بھی جگہ جگہ آیات و عنوانات اور حوالوں کے لیے استعمال ہوئی ہے لیکن م۱۵ میں م۳۰ کے مقابلہ میں سرخ روشنائی کا استعمال کچھ زیادہ ہے تکملہ کی تیسری جلد کتبخانہ کا خاص م۱۶ و م۱۷ ہے،

م۱۶، ۱۷ تیسری جلد کا آغاز :

"لن تنالوا البر (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے) ہرگز نیابید نکوئی یا نرسید بہشت را
(فارسی خط سیاہ روشنائی سے)

تیسری جلد م۱۶ کا اختتام :

"ان اللہ کان غفوراً رحیماً واللہ اعلم" (بخط فارسی) شروع صفحہ پر مہر [محمد جمال الدین [illegible]]

تیسری جلد م۱۷ کا اختتام

"ان اللہ کان غفوراً رحیما واللہ اعلم و علمہ احکم
تمت تمت" (بخط فارسی)

م۱۶ کے کل اوراق = ۳۲۰ (دبیز کاغذ) } سائز = ۳۰×۱۷،۱۱ حوض کا
م۱۷ کے کل اوراق = ۳۰۹ (باریک کاغذ) } ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں۔ سائز ۲۴×۱۲

دیگر خصوصیات | م۱۶ جگہ جگہ سے کاغذ پھٹ گیا ہے اور ٹریسپر لگا کر جوڑا گیا ہے، کرم خوردہ بھی ہے بعض جگہ سے حروف بھی کٹ گئے ہیں،

م۱۷ کہیں کہیں سے وصفت کے بعد جگہ جگہ کناروں پر کیڑا کھا لینے کے نشانات ہیں مگر اصل مکتوب حصہ محفوظ ہے م۱۷ کے شروع میں مہر نہیں ہے،

دونوں (مـ۱۶ و مـ۱۷) کے خط ایک جیسے ہیں

مـ۱۷ ورق مـ۲۳۲ کے بعد پورے پچاس ورق نہیں ہیں، حالانکہ اوراق پر نمبر مسلسل پڑے ہوئے ہیں اس لیے سرسری نظر سے دیکھنے پر مکمل معلوم ہوتی ہے، یہ نسخہ نسبت مـ۱۷ کے بوسیدہ بھی زیادہ ہے۔ تکملہ کی چوتھی جلد (کتب خانہ کا خاص مـ۱۸ و مـ۱۹)

چوتھی جلد مـ۱۸ مـ۱۹ کا آغاز

"والمحصنت من النساء الا ما ملکت ایمانکم (بخط نسخ، صرف مـ۱۹ میں سرخ روشنائی سے اور مـ۱۸ میں سیاہ سے) وحرام کردہ شد بر شما شوہر داران از زنان تا ب مختلف نشود نسب ضایع نگردد" (بخط فارسی سیاہ روشنائی سے)

چوتھی جلد مـ۱۸ و مـ۱۹ کا اختتام:

"او سبحانہ و حق تعالے شکایت غیر خود راہم نمی پسندد چہ جائی شکایت ذات خود را زیراکہ"

چوتھی جلد مـ۱۸ کی کل تعداد اوراق = ۳۲۲، ہر صفحہ میں = ۱۷ سطریں۔ سائز ۳۰×۱۷ (حوض کا سائز = ۲۴×۱۲) پہلے صفحہ کے حاشیہ پر (نیلی روشنائی سے) لکھا ہے: "تکملۂ تفسیر فتح العزیز"

آخری صفحہ پر (سیاہ روشنائی سے) لکھا ہے: "تم الجزو الخامس"

قابل ذکر امور | کاغذ اچھا چکنا، اوسط درجہ کی دبازت، درمیان میں متفرق جگہ پر مختلف قسموں کا کاغذ استعمال ہوا ہے، آیات قرآنی بخط نسخ (سیاہ روشنائی سے) تفسیر بخط فارسی۔ (سیاہ روشنائی سے)

خط عمدہ جلی، کہیں کہیں کرم خوردہ و شکستہ، بٹر پیپر سے جوڑا گیا،

ہر صفحہ پر باڈر، سرخ لائن ڈبل اور ایک سیاہ لائن (کل تین لائنس) سے بنایا گیا ہے،

مـ۱۹ (چوتھی جلد) کا سائز = ۳۱×۱۸ (حوض کا سائز = ۲۴×۱۲،۶) ہر صفحہ میں ۱۹ سطر کل اوراق = ۲۸۸، پہلے صفحہ کی پیشانی پر مہر (محمد جمال الدین خان مدار المہام ۱۲۶۸) پنسل سے اسی صفحہ کے بالائی کنارہ پر لکھا ہے: "تکملۂ فتح العزیز" سیاہ روشنائی سے حاشیہ پر لکھا ہے: "تفسیر علوم قرآن"

قرآنی آیات کی کتابت بخط نسخ عمدہ جلی (سرخ روشنائی سے) تفسیر بخط فارسی (سیاہ روشنائی سے) خط اوسط درجہ کا، عمدگی میں، درمیان میں بعض عنوانات بھی سرخ روشنائی سے ہیں، کہیں کہیں سے کرم خوردہ، پہلا صفحہ پانچ جگہ سے کرم خوردہ اور اس کا اثر تین جگہ کا کئی ورق تک پڑا، پوری جلد میں کاغذ یکساں اچھا، چکنا، اوسط درجہ کی دبازت، ہر صفحہ پر باڈر ڈبل سرخ لائن اور ایک سیاہ لائن کا۔ چوتھی جلد کا اختتام ناقص ہوا ہے کہ جملہ بھی پورا نہیں ہو سکا، تمام جلدوں میں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ۔ ایک ہی طرز خط کی پیروی کی گئی ہے، چنانچہ تقریباً ہر جگہ "گ" کو "ک" کی شکل میں (ایک ہی لائن سے) لکھا گیا ہے اور اکثر جگہ یائے معروف (ی) ہی کی صورت میں یائے مجہول (یے) بھی لکھی گئی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ تکملہ کی ان جلدوں میں سے کسی ایک پر بھی نہ تو کاتب (ناسخ) کا نام ملتا ہے، نہ سنہ و تاریخ کتابت کا ذکر، نہ شروع میں مقدمہ ہے، نہ آخر میں ایسی کوئی تفصیل جس سے تکملہ کے محرک یا سنہ و زمانہ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم ہو سکتیں حتیٰ کہ ان میں کہیں صاحب تکملہ کا نام بھی نہیں آیا، جس سے ان کے بارے میں داخلی شہادت ملتی بس مورخین کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے یقین کیا گیا ہے،

"تکملہ" پر بحیثیت مجموعی ایک نظر | یہ تکملہ، اصل تفسیر فتح العزیز سے منقولی رنگ۔ احادیث و روایات نیز قصص و حکایات کی کثرت میں تو بالکل مشابہ ہے، بلکہ بعض جگہ کثرت روایات

واٰثار نیز قصص وحکایات میں اصل سے کچھ بڑھ گیا ہے، لیکن شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی مجتہدانہ نظر، ژرف نگاہی اور عبقریت کی جو شان اصل تفسیر میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے تکملہ میں اس کی تلاش سعی لاحاصل ہوگی، پھر بھی بڑی حد تک اصل کی کچھ خصوصیات برقرار رکھنے کی صاحب تکملہ نے کوشش کی ہے خاص طور سے فرق باطلہ کی تردید قرآن مجید پر ملحدین اور متفلفین کے اعتراضات کی جوابدہی، قرآن مجید کی آیتوں پر بظاہر وارد ہونے والے لغوی، نحوی نیز دوسرے قسم کے اشکالات کا حل، آیت کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال کی موجودگی کی صورت میں کسی قول کو بدلائل ترجیح اور مختلف المعانی لفظ میں سے ایک یا چند معنی اختیار کرنے کے وجوہ واسباب جیسے امور سے خاطر خواہ بحث کی گئی ہے، اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تکملہ خاصی حد تک اصل کا رنگ لیے ہے جو تفسیر کے طالب علم کے لیے پُر از معلومات ہے، اس میں تکملہ نگار نے بہت سے نقول بھی یکجا کر دیے ہیں اس لیے تکملہ ان نقول کا عمدہ ماخذ بن گیا ہے، لیکن متقدمین کی اکثر تصانیف اور خود اصل تفسیر فتح العزیز کی طرح یہ بھی اجمالی حوالوں کا ہی مواد فراہم کرتا ہے جس سے بس کتاب کے نام کی حد تک ماخذ کی نشاندہی ہوتی ہے، موضع اور محل کا تعین نہیں ہوتا، اس لیے مکمل حوالہ کی تلاش اور صحیح موقع کے تعین کے طالب کو مزید محنت کرنا ناگزیر ہے۔

اصل کی طرح، تکملہ کی بھی زبان فارسی ہے جو بڑی سہل سلیس اور شیریں ہے کہ معمولی فارسی خواں بھی استفادہ کر سکتا ہے، علاوہ ازیں طباعت صاف اور جلی ہے، جس کو کمزور بینائی والا شخص بھی اسے پڑھ سکتا ہے اتنی ضخیم تفسیر جو گوناگوں خصوصیات کی جامع ہے اسے صرف لکھنا بھی کچھ کم اہم کارنامہ نہیں ہے، مگر افسوس کہ ابھی تک یہ طبع نہیں ہو سکی ہے، اس لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں بلکہ اکثر لوگوں کو تو اس کے وجود ہی کا علم نہیں ہے۔

تکملہ کے کچھ نمونے | تکملہ سے یہاں مختصر طور پر چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں، تاکہ ناظرین خود تھوڑا بہت اس کی قدر و قیمت اور بعض خصوصیات کا اندازہ کر سکیں،

(۱) "تکملہ" پہلی جلد کتبخانہ کا ۱۳ سورہ بقرہ آیت "وأن تصوموا خیر لکم" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تقدیر آیت کہ متضمن بر شرط است موافق فہم اکثر مفسرین اینست کہ اگر دانید فضیلت صوم را اختیار کنید و تخلف نورزید چون ما قبلش دلالت برین جزا دارد، لفظ "اختر صوم" را اسقاط فرمودہ اند و بعضی گفتہ اند کہ مراد از علم، خوف است، چنانچہ فرمودہ اند انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء پس گویا چنین فرمودند کہ اگر شما خوف خدا کنید مشقت و تکلیف روزہ خود برداشتن بہتر خواہد بود برائے شما وحاجت بفدیہ نخواہد نمود"۔ (ورق ۴۳ (ب)

(۲) تکملہ دوسری جلد۔ کتبخانہ کا ۱۵ سورۂ آل عمران آیت "یوتی الحکمۃ من یشاء ..... الخ" کے تحت مذکور ہے:

"مراد لفظ حکمت علم است یا فعل صواب و مروی است از مقاتل لفظ حکمت کہ در قرآن مجید واقع شدہ بچار معنی تفسیر کردہ اند یکے مواعظ و نصیحتہائے قرآنی .... دوم آنکہ حکمت بمعنی فہم و علم است، .... معنی سوم آنکہ مراد از آں نبوت و پیغمبری است .... چہارم قرآن مجید است کہ بحکمت از آں تعبیر میرود بسبب آنکہ عجائب اسرار در آں ودیعت نہادہ اند"[1] (ورق ۹۰ (الف)

---

[1] تکملہ نگار نے پہلے معنی کیلئے "ما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ" دوسرے کے لیے "ولقد آتینا لقمان الحکمۃ" تیسرے کیلئے "فقد آتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمۃ" اور چوتھے کیلئے "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ" کو بطور شواہد پیش کیا ہے،

(۳) تکملہ، چوتھی جلد کتبخانہ کا ۱۹ سورۃ النساء کی آیت "ولولا فضل اللہ علیک ورحمۃ لھمت طائفۃ منھم أن یضلوک" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"درینجا اعتراض وارد می شود کہ ظاہر ایں آیت نفی می کند موجود شدن قصد منافقین را با زلال آنجناب ...... جوابش آنکہ ضرور نیست کہ 'لھمت' جواب 'لو' باشد بلکہ ایں کلام تواند بود کہ مقدم باشد بر 'لو' وجواب آں در تقدیر ومقول باشد بر طریق قسم، وجواب 'لو' محذوف بود ...... وتقدیرش آنکہ" لقد ھمت طائفۃ منھم أن یضلوک ولولا فضل اللہ ورحمۃ لاضلوک" (ورق ۲۴۲ (الف)

دارالمصنفین کی نئی کتاب

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کی ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات کی دوسری جلد چھپ کر تیار ہوگئی ہے جو تمام تر ہندوستان کے مغل فرماں رواؤں کے دور سے متعلق ہے اس میں ہر مغل فرمان روا کے ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات اور اسکے مظاہر پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے،

قیمت :-

شیخ رشید رضا مصری کے سیاسی اور مذہبی افکار

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد راشد ندوی صدر شعبۂ عربی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

رشید رضا کا اصلاحی کارنامہ اور اسکی اہمیت

۱۹۰۵ء کے بعد اصلاحی کاموں کی تمام ذمہ داریاں رشید رضا کے سر ہوگئیں۔ جہاں انکو کئی محاذوں پر تنہا مقابلہ کرنا تھا۔ علمائے سوء جو مسلمانوں کی ہر مذہبی، تعلیمی اور سماجی اصلاح و ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ دوسرے مغربی نظریات و فلسفوں کے اثرات جو آہستہ آہستہ مختلف دھاروں سے عرب ممالک میں آرہے تھے مثلاً شام کے علاقہ میں غیر ملکی مدارس، یونیورسٹیاں، نیز مشنریز (missio n) کے ذریعہ مصر میں نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے اس گروہ کے ذریعہ جس کی کچھ تعلیم مصر میں ہوئی تھی لیکن اعلی تعلیم کے مواقع اسے یورپ میں ملے، مصر میں اس وقت تک اعلی تعلیم کا مرکز صرف ازہر تھا اور یہ طبقہ ازہر کی تعلیم و تربیت کو نہ تو پسند کرتا تھا اور نہ انھیں ان کے طریقۂ تدریس میں تشفی ملتی تھی اس لیے اسے جب اعلی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع یورپ کے مختلف ملکوں میں ملے تو اس نے مذہب، سماج اور تعلیم کے بارے میں مغربی نظریات کو بغیر ہضم کیے ہوئے قبول کرلیا اور انکی نشر

واشاعت کو عرب عوام میں تجدید و اصلاح کا واحد ذریعہ تصور کیا۔ اس سے دو طرح کے
خطرات لاحق تھے عوام کا جو طبقہ مذہبی عقائد کو بگڑی ہوئی شکل میں قبول کیے ہوئے تھا،
اس نئے ترقی پسند مصلحین کے طبقہ سے اس کا شدید تصادم کا ہونا ضروری تھا اور دوسرا نوجوانوں
کا وہ طبقہ جو نئی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور جنھیں اپنے آباء و اجداد کی علمی کاوشوں کی خبر نہیں تھی،
وہ آسانی سے ان ترقی پسند مجددین کے افکار کے جال میں آجاتا۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات
کے بجائے نئے لوگوں کے مذہب کی تفسیر و تاویل کو قبول کر لیتا جس میں اسلامی فکر اور
مشرقی اقدار کے بجائے مغربی عقائد و فلسفہ اور طریقۂ معیشت کارفرما ہوتا۔ سب سے عجیب
کی بات یہ کہ شیخ محمد عبدہ کے وہ مصری شاگرد جنھیں اپنے استاذ کی شاگردی پر ناز و فخر تھا
وہ بھی اپنے استاذ کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے ترقی پسندی کی تیز ہوا کے دھارے میں
اپنا ذہنی و فکری توازن کھو بیٹھا جب کہ نئے علوم کی ضرورت ہر سماج کے لیے اتنی ہی ہے،
جتنی کہ ہوا اور پانی اور روشنی کی ہوتی ہے اور اگر عوام میں دینی و دنیاوی علوم کی تفریق کا
خطرناک زہر پھیلایا گیا تو پورا سماج شل ہو جائے گا اور پوری سوسائٹی کی بنیادیں ڈھے
پڑیں گی اور ہر علاقہ کا مسلمان ذہنی غلامی کا اس طرح شکار ہو جائے گا کہ اسے کبھی بھی
نجات نہ مل سکے گی۔ کیونکہ مذہبی فرائض کے انجام دینے کے بعد زندگی کی تمام ضروریات
کے لیے وہ دوسروں کا غلام رہے گا۔ اس طرح رشید رضا نے تقریباً چالیس سال تک
اصلاح و تجدید کا بیڑہ اٹھائے رکھا۔

اس مفکر کو جہاں عوام کو صحیح مذہبی افکار اور صحیح عقائد سے روشناس کرانا تھا وہیں
اس کو ۱۹۰۵ء سے لے کر (یعنی محمد عبدہ کے انتقال کے بعد) ۱۹۳۵ء تک مسلمانوں کی سیاسی
رہنمائی بھی کرنی پڑ رہی تھی، کیونکہ گذشتہ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک پوری عرب دنیا نہایت نازک

مرحلوں سے گذری۔ بلکہ اسی دور میں مصر کی غلامی کے بعد آہستہ آہستہ تمام عرب ممالک
یکے بعد دیگرے غیر ملکی سامراج کے چنگل میں آتے گئے۔ ان حالات میں جو بھی سیاسی تحریکیں
اٹھیں یقیناً وہ اخلاص پر مبنی تھیں۔ مصر میں حزب الوطنی جس کی رہنمائی مصطفیٰ کامل کر رہے تھے
اور جو اپنی غیر معمولی شخصیت کی بنا پر مصری عوام کے محبوب لیڈر بن گئے تھے۔ اس کے بعد
ایک معتدل تحریک جس کی پالیسی حالات سے مصالحت کی تھی، اس کی قیادت لطفی السید کر رہے
تھے، پھر انگریزوں کی جارحانہ سیاست سے عوام کی بیداری بڑھتی جا رہی تھی، یہ بیداری بعد میں
حزب الوفد کے نام سے رونما ہوئی جس کی قیادت سعد زغلول کر رہے تھے، ادھر شام، حجاز
اور عراق میں دولت عثمانیہ کے خلاف عوام کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے جن کو عرب
قوم پرور رہنما اور آگے بڑھا رہے تھے اس طرح مصر کے عوام میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا
ہو گئی۔ اس وقت میدان میں تنہا رشید رضا اور ان کا مجلہ المنار روشنی کا مینارہ بنکر عوام کی
صحیح ذہنی تربیت اور قیادت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

رشید رضا کے افکار

رشید رضا کا خیال تھا کہ جہاں تک اسلام کے وہ عقائد جو قرآن و حدیث
کی روشنی میں بڑی حد تک متعین ہو چکے ہیں اور ان پر علماء سلف کا تقریباً اتفاق بھی ہو چکا ہے،
ان مسائل کو اس زمانہ میں چھیڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان عقائد میں مسئلۂ توحید،
مسئلۂ نبوت، قرآن کا آخری کتاب ہونا، حدیث کی اہمیت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،
صحابۂ کرام کا قول و عمل، یہ ہر زمانہ میں لوگوں کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ مسائل
جو انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی اور حالات کی تبدیلی سے پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے
رہیں گے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی وہ جماعت جسے اللہ تعالیٰ نے علم صحیح اور عقل سلیم
عطا فرمائی ہے وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے گی۔ اس طرح

شیخ رشید رضا نے بڑے وثوق وجرأت کے ساتھ بیسویں صدی میں یہ بات کہی کہ اجتہاد کا دروازہ
نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہوگا۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا یہ مطلب ہے کہ امت مسلمہ کی
ہر جماعت سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوگئی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی و
فکری توانائی اس وقت تک باقی و برقرار رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ دنیا اور دین کے تمام
علوم سے بہرہ ور ہوں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ کسی دور میں بھی اسلامی سوسائٹی کو دو گروہوں میں
بانٹا نہیں جا سکتا یعنی ایک گروہ علمائے دین کا ہو اور دوسرا گروہ علمائے دنیا کا۔ ایک کی
ذہنی کاوشیں علوم دینیہ میں صرف ہوں اور دوسرے کی علوم دنیاوی میں۔ بلکہ علوم دینی
و علوم دنیاوی دونوں کا سیکھنا اور جاننا ہر زمانہ میں معاشرہ کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے،
اور خاص طور سے اس زمانہ میں، عرب ممالک ان تمام تحریکوں کی مدد کر رہے تھے اور کبھی کبھی
ان کے رہنماؤں کو لالچ بھی دلا رہے تھے۔ بہر صورت یہ تحریکیں جس تیزی سے انھیں ان کا
دشمن یا ترکوں اور ان کے درمیان مصالحت کرانا آسان نہیں تھا کیونکہ دونوں ایک دوسرے
کے خلاف آخری منزل تک پہونچ چکے تھے، رشید رضا بھی دولت عثمانیہ کی زیادتیوں اور
ان کے حکام کی غیر حکیمانہ سیاست سے نالاں و پریشان تھے لیکن جب ان کے خلاف
قومیت کی تحریک تیزی سے بڑھنے لگی تو ان کو آنے والے خطرات کا بھی احساس ہوا،
لیکن وہ اس لئے کہ انھوں نے ترکوں کے خلاف تو لکھا لیکن عرب قوم پرستوں کو گوارہ
بتانے سے عاجز ہو گئے تھے۔ ترکوں اور عربوں کے باہمی اختلافات کا پہلا اثر سرزمین حجاز
میں نمایاں ہوا جبکہ شریف حسین نے وہاں بغاوت کی اور ترکی فوجوں کو اس علاقہ سے نکلنے
پر مجبور کیا۔ اس کے بعد شام و عراق سے بھی آہستہ آہستہ عرب عوام ترکی حکومت سے نجات
حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ جن لوگوں کی شہ پر انھوں نے

یہ کامیابی حاصل کی ہے وہی لوگ دوسری طرف ان کی قبر تیار کر رہے ہیں۔ اس لیے ترکوں سے
آزادی کی خوشی ان کی عارضی تھی۔ کیونکہ انھی اوقات میں فرانس و برطانیہ خفیہ طور پر خاموشی اور پوشیدگی
سے ان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ چنانچہ انگریزوں کو عراق، فلسطین اور امارات عربیہ حصہ
میں ملا اور شام کا پورا علاقہ فرانس کو مل گیا۔ اس طرح انگریزوں کی وہ سیاست جو مصر سے
لے کر ہندوستان تک تھی اس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ دوسرے فرانس کی نظر ہمیشہ شام کے
ساحلی علاقوں پر تھی، اس نے خوشی خوشی اس علاقہ کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اور بیسویں صدی
کی تیسری دہائی کے خاتمہ تک نجد و حجاز کے علاوہ تمام عرب ممالک غیر ملکی سامراج
کے غلام بن گئے۔

اسی زمانہ میں مغربی طاقتوں نے دولت عثمانیہ پر جارحانہ کارروائیاں شروع کیں
اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا، اتفاق سے مصطفیٰ کمال نے فوج کی قیادت اپنے
ہاتھ میں لے کر ترکی بولنے والے علاقوں کو غیر ملکی سامراج سے بچا لیا۔ لیکن خلافت کے خاتمہ
کا اعلان کر کے سیکولر (غیر دینی) حکومت کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان دنیائے اسلام کے لیے
بڑا خطرناک ثابت ہوا۔ عربوں میں اس وقت دو رجحان تھے۔ ایک رجحان مصطفیٰ کمال کی
کارروائیوں سے پوری طرح متفق تھا بلکہ انھیں سراہ رہا تھا، مصر میں جو ترقی پسند طبقہ
تھا اس نے مصطفیٰ کمال کی اس کارروائی کو ترکوں کا اندرونی مسئلہ تصور کیا اور نئے اعلان
کے تحت جو بھی سیاسی ڈھانچہ وہاں کے لیے مرتب ہوتا اس کا خیر مقدم کرتا۔ اس وقت
رشید رضا جو کل تک دولت عثمانیہ کے خلاف لکھ رہے تھے اب وہ خلافت کے پوری طرح
حامی بن گئے اور مصطفیٰ کمال کے اعلان کو غیر عقلمندانہ قرار دینے لگے بلکہ اس اعلان کو انھوں
نے اسلام کے منافی بھی تصور کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

جو بعد میں الخلافۃ او الامامۃ العظمیٰ کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ جس میں انھوں نے اسلامی خلافت کی اہمیت کو واضح کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ ایسی حکومت کا ہونا ضروری ہے جس میں اسلامی احکام و شعائر کی پاسبانی کی جا رہی ہو اور خلافت اسلامیہ کی رمز و علامت ہو۔ خلافت کا مسئلہ مصر میں رشید رضا اور ان کے چند ہمنوا اٹھائے ہوئے تھے جس کی بازگشت ہندوستان میں بھی خلافت تحریک کے نام سے وجود میں آئی جس سے یہاں کا ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے۔

رشید رضا مصر کے ان ترقی پسند رہنما اور ادبا سے بالکل متفق نہیں تھے جو غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ مصالحت کی دعوت دے رہے تھے اور اس طرح وہ ترقی پسند مفکرین کے ان نظریات کے بھی مخالف تھے جو غیر ملکی تعلیم و تربیت اور نظام و قانون کو من و عن قبول کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی علاقہ میں جہاں کے عوام کا ایک خاص مذہب ہو، ان کی طویل اور شاندار تاریخ ہو، ان کے آباء و اجداد کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر روشن ہوں، ان سب کو نظر انداز کر کے کسی غیر ملک یا قوم کے تعلیمی اور سیاسی نظام کو قبول کر لینا اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے بجائے ہلاکت کے گڈھے میں ڈھکیلنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ جب کوئی قوم اپنے کو اپنے شاندار ماضی سے الگ کر کے غیروں کے طور طریقے اور زبان و ادب کو اپنا لے تو وہ معنوی اعتبار سے بالکل ختم ہو جائے گی اور جغرافیائی اعتبار سے اس کا وجود دنیا کے نقشہ پر تو یقیناً رہتا ہے لیکن سیاست کی .... میزان میں اس کا کوئی بھی وزن نہیں رہتا۔ چنانچہ اس خطرہ کی نشاندہی اپنے مؤقر رسالہ المنار میں کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں وہ انگریزوں کے معتوب رہے اور وہ ان کے اور ان کے رسالہ کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اسی طرح جب فرانس نے

شام پر قبضہ کر لیا جو ان کا وطن عزیز تھا تو اب وہ دولت عثمانیہ کے بجائے فرانسیسی سامراج کے خلاف آزادی کے مجاہدین کے ساتھ ساتھ لڑتے رہے۔ شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ رشید رضا جن عقائد و اصول کے حامل تھے اس کو وہ زندگی بھر نباہتے رہے، اور غیر ملکی سیاست کے خلاف زندگی بھر جہاد کرتے رہے اور انھوں نے کبھی صلح نہیں کی، لاکھ ان کو ہر طرح کی لالچ دلائی گئی لیکن اس مرد مجاہد نے فقر کی زندگی کو اس پر ترجیح دیا اور کبھی بھی دین و وطن کا سودا نہیں کیا۔

شیخ رشید رضا اس منزل میں اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ سے کچھ مختلف ہو جاتے ہیں شیخ محمد عبدہ نے جلا وطنی کے بعد مصر واپس آنے پر انگریزوں کے سلسلہ میں نرم رویہ اپنا لیا تھا لیکن رشید رضا نے مربی اول جمال الدین الافغانی کی سیاست کو دوسری دہائی کے بعد زیادہ مناسب سمجھا۔ کیونکہ سامراجی طاقتوں نے دنیائے عرب اور دنیائے اسلام کے عوام پر جو مظالم ڈھائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ، ان کے مذہب اور ان کی زبان کے خلاف سازشوں کا جو سلسلہ جاری رکھا، اس کو کوئی بھی انسان جس کے دل میں اپنے مذہب کی محبت اور اپنی قوم سے لگاؤ ہے، گوارہ نہیں کر سکتا۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کا یہ زمانہ عرب کی تاریخ کا سب سے نازک تر زمانہ تھا۔ اس عرصہ میں جو بھی رہنما اور مصلحین پیدا ہوئے ان کی ساری طاقتیں اور توانائیاں غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑتے ہوئے ختم ہوئیں اور اگر ان کے ملک میں آزادی ہوتی تو شاید اس عرصہ میں کوئی سنجیدہ اور تعمیری کام کر پاتے۔ مصطفیٰ کامل جیسا ذہین، سعد زغلول جیسا مدبر، محمد عبدہ جیسا مفکر، رشید رضا جیسا مخلص۔ ان سب کی طاقتیں اور توجہات اندرونی مسائل کو سلجھانے اور غیر ملکی سامراج کی معاندانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوئیں۔ ان لوگوں کی زندگی سے

یقیناً عزم و عزیمت کی ایک شاندار تاریخ تو مرتب ضرور ہوتی ہے لیکن بیسویں صدی کے عوام ان کے بیش علمی اور فکری کارناموں سے یکسر محروم رہ جاتے، کیونکہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اگر کوئی کام کرتے تو ان کے ذہن و فکر کے جوہر سے علم و ادب کی تاریخ مالا مال ہوتی مگر اس عرصہ کا پورا لٹریچر وقتی ہی نظر آتا ہے، بہرصورت رشید رضا تقریباً نصف صدی تک عرب عوام کی مذہبی، سیاسی اور تعلیمی قیادت کرتے رہے اور جتنا ان کا ذہن رسا تھا ان کے قلم کو بھی ایک طاقت حاصل تھی۔ شکیب ارسلان ایک جگہ لکھتے ہیں:

کرنے دور کے مصنفین اور ادبا کے کارناموں کا موازنہ جب خود سے کرتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے علمی کارنامے سب سے زیادہ ہیں، البتہ شیخ رشید رضا پہ مجھے ہمیشہ رشک ہوتا رہا کہ انھوں نے پچاس سال کے عرصہ میں جو کچھ لکھا اور رکھا، کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے میرے علمی کارناموں پر بھاری رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ المنار کے علاوہ انھوں نے اس زمانہ کے جو بھی اہم موضوعات تھے ان پر لکھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی سے کتنے واقف، حال سے کتنا باخبر اور مستقبل کے بارے میں کس قدر سوچتے اور غور کرتے تھے۔ یہی ایک بڑے انسان کی بڑائی کی علامت ہے۔

مولانا شبلی پر ایک نظر

مولانا کی مختصر سوانحعمری کے ساتھ ان کے علمی و تحقیقی کارناموں اور ان کے ملی و قومی خدمات کی تفصیل اور ان کی تمام تصنیفات کا اجمالی ذکر ہے، مولانا شبلیؒ رشید رضا کی شخصیت سے بہت متاثر تھے اور ان کو ندوہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء کا صدر بنایا تھا۔ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم قیمت ۱۰ روپیے۔

محیط الدائرہ پر ایک نظر

از
ڈاکٹر انوار الحسن صاحب صدر شعبۂ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی

پیش نظر کتاب علم عروض پر عربی زبان میں لکھی گئی ہے جو انگریز مستشرق VENDYKE کی تصنیف ہے، فاضل مصنف نے زبان موضوع کے اعتبار سے سادہ اور آسان استعمال کی ہے اور علم عروض کے وسیع و عریض فنون کو مختصر، جامع اور پُروقار طریقہ پر پیش کیا ہے، سب سے پہلے علم عروض کی تعریف سے بحث کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عروض وہ علم ہے جس میں اوزان شعر اور اس کے تصرفات سے بحث کی جاتی ہے۔

اس ضمن میں علم عروض کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ وہ علم ہے جس پر کسی شی کو پیش کیا جاتا ہے، اس لیے اس کا نام "عروض" رکھا گیا۔

مصنف نے دوسرے گروہ کا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ چونکہ علم عروض کا بانی خلیل بن احمد مکہ میں اس علم کے وضع کرنے پر مائل ہوا اور وہیں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس لیے برکت کے خیال سے "عروض" نام رکھا جو مکہ کا بھی ایک قدیم نام ہے۔

اس بحث کے بعد مصنف نے "شعر" کی تعریف بیان کی ہے اور کہا ہے کہ "شعر وہ کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ کو قصد اور ارادہ سے پیش کیا جائے"۔ یعنی وہ کلام

جو موزوں تو ہے لیکن اس میں ارادہ کو دخل نہیں تو وہ شعر کی تعریف سے خارج ہے،
اسی لیے قرآن مجید کی وہ آیتیں جو وزن پر پوری اترتی ہیں لیکن شعر نہیں کہی جاسکتی ہیں
کیونکہ یہ ارادۃً نہیں کہی گئی ہیں جیسے:

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

مصنف کے بیان کے مطابق شعر مختلف اجزاء سے مرکب ہوتا ہے جنھیں تفاعیل
کہا جاتا ہے اور یہ اسباب اوتاد اور فواصل سے مل کر بنتا ہے۔ اگر کچھ مرکب ہوں تو
ایک "بیت" بنتی ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ سبب دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک سبب "خفیف" جس
میں ایک حرف متحرک کے بعد ایک حرف ساکن آتا ہے جیسے: ہَلْ - فِیْ - وغیرہ
دوسرا "سبب ثقیل" ہے جس میں دو متحرک حروف ساتھ آتے ہیں جیسے:
مَعَ - لَکَ وغیرہ۔

اسی طرح "وتد" کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک "وتد مفروق" یعنی دو متحرک حروف
کے درمیان ایک حرف ساکن کا استعمال جیسے: کَیْفَ - حَیْثُ - لَیْتَ وغیرہ،
دوسرا "وتد مجموع" کہلاتا ہے جس میں دو متحرک حروف کے بعد ایک حرف
ساکن آتا ہے جیسے: عَلٰی - اَقِمْ - اَدِرْ وغیرہ۔

"فاصلہ" کی بھی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں: فاصلۂ صغریٰ اور فاصلۂ کبریٰ۔ فاصلۂ صغریٰ
میں تین متحرک حروف کے بعد ایک حرف ساکن آتا ہے جیسے: ضَرَبَتْ، اور فاصلۂ
کبریٰ میں چار متحرک حروف کے بعد ایک حرف ساکن آتا ہے جیسے: ضَرَبَکُمْ۔

اگر اسباب اوتاد اور فواصل کی ایک جگہ مثال دیکھنا ہو تو فقرۂ ذیل میں دیکھیے

جس میں سبب خفیف، سبب ثقیل، وتد مفروق، وتد مجموع، فاصلۂ صغریٰ اور فاصلۂ
کبریٰ کی ساری اقسام آجاتی ہیں:

لَمْ اَرَ عَلٰى ظَهْرِ جَبَلٍ سَمَكَةً

جَبَلٍ اور سَمَکَۃً میں تنوین کو ایک حرف مان لیجیے اس لیے کہ آواز "نون" کی
آتی ہے اور وہی ساکن ہے۔

واضع علم عروض کا کہنا ہے کہ ہر جزو شعر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اوتاد،
اسباب اور فواصل ہوں۔ وہ اجزاء جن میں وتد پہلے آتا ہے "اجزاء اصلی" کہلاتے ہیں
اور جن میں وتد پہلے نہ آئے "اجزاء فروعی" کہلاتے ہیں۔

اجزاء اصلی چار ہوتے ہیں: فعولن، مفاعیلن، مفاعلتن، فاعلاتن
اجزاء فرعیہ کی بھی چار قسمیں ہیں: فاعلن، مستفعلن، فاعلاتن اور
متفاعلن۔ انھی اجزا کی ترتیب بدلنے سے باقی اجزاء مرتب ہوتے ہیں۔ اجزاء،
ارکان، امثلہ، افاعیل اور تفاعیل ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ ان کے حروف
کو حروف تقطیع کہا جاتا ہے۔ تقطیع کرتے وقت حروف ملفوظہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے،
غیر ملفوظ تقطیع میں ساقط ہو جاتے ہیں۔

یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ "بیت" اجزاء سے مرکب ہوتی ہے اور یہ پانچ
رکنی یا سات رکنی ہوتے ہیں۔ جن سے تین بحریں نکلتی ہیں۔

بحر طویل۔ بحر جدید۔ بحر بسیط۔

اگر اجزاء منفرد ہوں تو ان سے گیارہ بحریں نکلتی ہیں جن کی تفصیل درج
ذیل ہے:

وافر۔ کامل۔ خفیف۔ مضارع۔ مقتضب مجتث۔

خماسی اجزاء سے بحر متقارب اور بحر متدارک پیدا ہوتی ہیں۔

ایک "بیت" دو مساوی حصوں یا مصرعوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ پہلے حصہ یا مصرع کو "صدر" اور دوسرے کو "عجز" کہتے ہیں۔ صدر کا آخری حصہ "عروض" اور عجز کا آخری حصہ "ضرب" کہلاتا ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہو اسے "حشو" کہتے ہیں۔ اگر کسی بیت کے سارے اجزاء پورے مستعمل ہوں تو وہ "بیت تام" کہلاتی ہے۔ اگر کسی سبب کے دونوں کنارے حذف کر دیے جائیں تو ایسی بیت کو "مجزوع" کہیں گے اور اگر ایک کنارہ حذف کیا جائے تو وہ بیت "مشطور" کہلائے گی۔ اگر تہائی حذف ہو تو "منہوک" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

خلیل بن احمد نے بیت شعر یعنی گھر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں دونوں مصرعے دونوں دروازوں کے مانند ہوتے ہیں۔ بیت شعر اسباب کے بغیر نہیں بن سکتا جیسے کسی خیمہ کو کھڑا کرنے کے لیے رسیاں ضروری ہوتی ہیں۔ اوتاد ان رسیوں کو روکنے کا کام کرتے ہیں۔ فواصل ان دونوں میں ربط پیدا کرتے ہیں۔

مذکورۂ سابقہ بحریں اپنے اصلی اجزاء کے اعتبار سے پانچ دائروں میں منقسم ہوتی ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

پہلا دائرہ "مختلفہ" | یہ نام اس لیے پڑا کہ اس کے اجزاء میں اختلاف ہے۔ کچھ بحروں کے اجزاء خماسی اور کچھ کے سباعی ہوتے ہیں۔ اس دائرہ سے نکلنے والی بحریں جو عام طور پر مستعمل ہیں حسب ذیل ہیں:

بحر طویل۔ فعولن۔ مفاعیلن۔ فعولن۔ مفاعیلن
بحر وسیط فاعلاتن۔ فاعلن۔ فاعلاتن۔ فاعلن

بحر بسیط۔ مستفعلن۔ فاعلن۔ مستفعلن۔ فاعلن

اس دائرہ سے دو غیر مستعمل بحریں بھی نکلتی ہیں جن کو دور جدید میں استعمال کیا جاتا ہے۔

بحر مستطیل۔ مفاعیلن۔ فعولن۔ مفاعیلن۔ فعولن
بحر ممتد۔ فاعلن۔ فاعلاتن۔ فاعلن۔ فاعلاتن

دوسرا دائرہ "مؤتلفہ" اس کے اجزاء میں ائتلاف ہوتا ہے یعنی یکسانیت ملتی ہے اور اس کے سب اجزاء سباعی ہوتے ہیں۔ اس سے تین بحریں نکلتی ہیں ایک غیر مستعمل ہے اور دو مستعمل۔ مستعمل بحروں کے نام اس طرح ہیں:

بحر وافر۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن

بحر کامل۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن

غیر مستعمل بحر کو بھی بعد کے شعراء نے استعمال کیا ہے اور اس کا نام "بحر متوفر" ہے فاعلاتک فاعلاتک۔ فاعلاتک

تیسرا دائرہ "مجتلبہ" | اس دائرہ کے سارے اجزاء دائرۂ مختلفہ سے ماخوذ ہیں۔ اس سے تین بحریں نکلی ہیں اور یہ تینوں مستعمل ہیں:

بحر ہزج۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن
بحر رجز۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔
بحر رمل۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔

چوتھا دائرہ "مشتبہ" | اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی بحروں میں اشتباہ پایا جاتا ہے۔ اس دائرہ سے درج ذیل نو بحریں نکلتی ہیں جن میں سے چھ مستعمل اور تین غیر مستعمل ہیں:

بحر سریع۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ فعولاتن
بحر منسرح۔ مستفعلن۔ فعولاتن۔ مستفعلن

بحر خفیف۔ فاعلاتن۔ مستفعلن۔ فاعلاتن

بحر مضارع۔ مفاعیلن۔ فاعلاتن۔ مفاعیلن

بحر مقتضب۔ مفعولاتن۔ مستفعلن۔ مستفعلن

بحر مجتث۔ مستفعلن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔

غیر مستعمل بحروں کی تفصیل یوں ہے:

بحر جدید۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ مستفعلن

بحر منسرد یا بحر قریب۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ فاعلاتن

بحر مشاکل یا بحر متسرد۔ فاعلاتن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن

پانچواں دائرہ "متفقہ": خلیل بن احمد کے نزدیک اس دائرہ سے ایک مستعمل بحر "متقارب" نکلتی ہے جس کا وزن فعولن۔ فعولن ہے۔ لیکن بعض عروضیوں نے اس دائرہ سے ایک اور بحر نکالی ہے یعنی بحر متدارک۔ فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن۔

وہ تغیرات جو اجزاء بیت پر لاحق ہوتے ہیں دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو اسباب سے متعلق ہوتے ہیں، "وہ زحاف" کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم کے تغیرات اوتاد اور اسباب سے متعلق ہوتے ہیں، "وہ علت" کہلاتے ہیں۔

صاحب "محیط الدائرہ" کے بیان کے موجب "زحاف" وہ تغیر ہے، جو سبب کے حرف ثانی پر لاحق ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کی دو قسمیں قرار دی ہیں، زحاف منفرد ــ زحاف مزدوج:

پھر زحاف منفرد کی قسمیں آٹھ ظاہر کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ الخبن۔ یعنی دوسرے حرف ساکن کا حذف کرنا جیسے مُستَفعِلُن کی "س"

۲۔ الوقص۔ یعنی دوسرے حرف متحرک کو حذف کرنا جیسے مُتَفاعِلُن کی "ت"

۳۔ الاضمار۔ یعنی دوسرے حرف متحرک کو ساکن کرنا جیسے مُتَفاعِلُن کی "ت"

۴۔ الطی۔ یعنی چوتھے حرف ساکن کو حذف کرنا جیسے مُستَفعِلُن کی "ف"

۵۔ القبض۔ یعنی پانچویں حرف ساکن کو حذف کرنا جیسے فَعُولُن کا "ن"

۶۔ العقل۔ یعنی پانچویں حرف متحرک کو حذف کرنا جیسے مُفَاعَلَتُن کا "ل"

۷۔ العصب۔ یعنی پانچویں حرف متحرک کو ساکن کرنا جیسے مُفَاعَلَتُن کا "ل"

۸۔ الکف۔ یعنی ساتویں حرف ساکن کو حذف کرنا جیسے فاعِلاتُن کا "ن"

"زحاف مزدوج" کی چار قسمیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ الخبل۔ یعنی کسی رکن میں "خبن" اور "طی" کا اجتماع ہونا جیسے مُستَفعِلُن کی "س" کو حذف کرنا اور "ف" کو حذف کرنا۔

۲۔ الخزل۔ یعنی کسی رکن میں "اضمار" اور "طی" جمع کیے جائیں جیسے متفاعلن کی "ت" کو ساکن کرنا اور "الف" کو حذف کرنا

۳۔ الشکل۔ یعنی "خبن" اور "کف" کا اجتماع ہونا جیسے مستفعلن کے س کو اور "نون" کو حذف کرنا۔

۴۔ "النقص" یعنی کسی رکن میں "عصب" اور "کف" کا یکجا کرنا جیسے مُفاعَلَتُن کے "ل" اور "نون" کو حذف کرنا۔

"علت" یعنی تغیر کی وہ قسم جو اوتاد اور اسباب میں مشترک ہوتی ہے۔ یہ کبھی کسی حرف کی زیادتی اور کسی کی کمی سے واقع ہوتی ہے۔ اگر زیادتی سے علت واقع ہو تو اس کی تین شکلیں ہوتی ہیں:

۱۔ الترفیل: یعنی کسی وتد مجموع کے آخری جزو میں کسی سبب خفیف کا اضافہ کرنا جیسے مُتَفَاعِلُن سے متفاعلاتن کر دیا جائے۔

۲۔ التذئیل: کسی وتد مجموع کے آخری جزو میں حرف ساکن کا اضافہ کیا جائے جیسے متفاعلن کو متفاعلان کرنا۔

۳۔ التسبیغ: یعنی کسی سبب خفیف کے آخر میں ایک حرف ساکن کا اضافہ کر دینا جیسے فاعلاتن کو فاعلاتان کر دیا جائے۔

صاحب محیط الدائرہ کے کہنے کے مطابق اگر علت کسی رکن کی کمی کی وجہ سے واقع ہو تو اس کی مندرجۂ ذیل قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ الحذف: یعنی آخری جزو کے سبب خفیف کو ہٹا دیا جائے جیسے مفاعیلن سے "لن" کم کر دیا جائے۔

۲۔ القطف: یعنی آخری سبب خفیف کو گرا کر اس کے ماقبل حرف متحرک کو ساکن کر دینا جیسے مفاعلتن سے "تن" حذف کر دیا جائے اور "ل" ساکن کیا جائے۔ سہولت کے لیے اسے فعولن میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ القطع: یعنی آخری جزو کے آخری وتد مجموع کو حذف کرنا اور اس کے ماقبل حرف متحرک کو ساکن کرنا جیسے متفعلن کا "ن" گرا کر "ل" ساکن کیا جائے۔

۴۔ التشعیث: یعنی فاعلاتن کے کسی ایک متحرک وتد کو حذف کرنا۔

۵۔ الحذذ: یعنی متفاعلن سے علن گرا دیا جائے۔

۶۔ الصلم: مفعولات سے لات گرا دی جائے۔

۷۔ الکشف: مفعولات سے آخری وتد مفروق کو حذف کر دیا جائے۔

۸۔ الوقف: مفعولات کے آخری وتد مفروق کو ساکن کرنا۔

۹۔ البتر: فاعلاتن سے "تن" حذف کریں، الف گرائیں اور "ل" کو ساکن کریں۔

کتاب کا آخری حصہ عیوب و محاسن قوافی سے متعلق ہے۔ قافیہ کے بارے میں صاحب محیط الدائرہ بتاتے ہیں کہ یہ وہ حرف ہے جو کسی شعر کے آخر میں استعمال ہو اور آواز کی مماثلت پائی جائے۔ ضروری ہے کہ تمام حرکات قافیہ کا اعادہ ہوتا رہے اور ہر بیت میں وہی اعراب لائے جائیں جو بیت اول میں ہیں۔ حروف قافیہ کے سلسلے میں "حرف روی" کی شہرت اور اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ حرف ہے جس پر قصیدہ کی بنیاد رکھی جائے۔

استفسار و جواب

سورۂ انعام کی چند آیتوں میں خطاب اور ضمیروں کی تعیین

ایک صاحب نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے سورۂ انعام کی بعض آیتوں کے متعلق چند سوالات کے جواب معلوم کرنا چاہا ہے، لکھتے ہیں

۱- آیت ۵۲ [وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ] اور آیت ۶۸ [وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِيْنَ] میں خطاب کس سے ہے؟

۲- مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۵۲) اور مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۶۹) میں خط کشیدہ ضمیروں کا مرجع کیا ہے

۳- تینوں آیتوں میں دعوت دین کے کیا اصول بیان ہوئے ہیں؟

پہلے آیات مسئول عنہا ملاحظہ ہوں تاکہ دریافت طلب امور آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

۱- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	اور ان لوگوں کو اپنے سے دور
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ	نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے خداوند کو

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ	پکارتے ہیں اس حال میں کہ اس کی خوشنودی
مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَّمَا	چاہتے ہیں، تم پر ان کی کچھ ذمہ داری
مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ	نہیں اور نہ تمھاری کچھ ذمہ داری
فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ	ان پر ہے کہ تم ان کو دور کر کے ظالموں
الظّٰلِمِيْنَ (انعام: ۵۲)	میں سے ہو جاؤ۔
۲- وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِيْنَ	اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو
يَخُوْضُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا فَأَعْرِضْ	ہماری آیتوں میں میں میخ نکالتے
عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ	ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ،
غَيْرِهٖ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ	یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول
فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى	ہو جائیں اور اگر تمھیں شیطان بھلا دے
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝	تو یاد آجانے کے بعد ظالم لوگوں کے
(انعام: ۶۸)	پاس نہ بیٹھو۔
۳- وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ	جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان
مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ	لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری
وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ	نہیں ہے، بس یاددہانی کر دینا ہے
(انعام: ۶۹)	تاکہ وہ بھی ڈریں،

اب سوالات کے نمبروار جواب ملاحظہ ہوں۔

۱- دونوں آیتوں میں بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، لیکن اس طرح کے مواقع پر عموماً خطاب کا رخ پوری جماعت و امت کی طرف ہوتا ہے

اور درحقیقت آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو مخاطب کرنا مقصود ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست اس لیے مخاطب کیا جاتا ہے کہ آپ قوم و امت کے امام و ترجمان ہیں، اسی لیے بعض موقعوں پر خطاب کی ابتدا واحد کے صیغہ سے ہوتی ہے، مگر آگے چل کر وہ جمع کے صیغوں میں تبدیل ہو جاتا ہے کیونکہ مقصود پوری جماعت سے خطاب ہوتا ہے مثلاً

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ	تو تم جمے رہنا جیسا کہ تمہیں حکم ملا ہے اور
تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ	وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَلَا تَرْكَنُوا	کی ہے اور کج نہ ہونا، بے شک جو کچھ
إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ	تم کر رہے ہو اس کو اللہ دیکھ رہا ہے،
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ	اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہو
اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا	جنھوں نے ظلم کیا کہ تمہیں دوزخ کی
تُنْصَرُونَ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ	آگ پکڑے اور تمہارے لیے اللہ
طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ	کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمہاری
اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ	مدد نہیں کی جائے گی اور نماز کو قائم
السَّيِّئَاتِ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ	کرو دن کے دونوں حصوں میں اور
لِلذَّاكِرِينَ ۝	شب کے کچھ حصے میں، بے شک
(ہود: ۱۱۲ تا ۱۱۴)	نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں، یہ
	یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے
	والوں کے لیے۔

یہاں خطاب واحد سے شروع ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست مخاطب کیا گیا مگر بعد میں تمام صیغے وَلَا تَطْغَوْا، بِمَا تَعْمَلُونَ، وَلَا تَرْكَنُوا، فَتَمَسَّكُمُ، مَا لَكُمْ اور لَا تُنْصَرُونَ جمع کے لائے گئے، اس کے بعد پھر واحد کا صیغہ وَأَقِمِ آیا مگر آخر میں ذٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ بھی کہا گیا۔

نبی کے واسطے سے امت کو مخاطب کرنے کی مثال اس آیت میں بھی ملتی ہے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا	اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور
تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ	منافقوں کا کہنا نہ مانو، بے شک اللہ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا	جاننے والا حکمت والا ہے اور اس چیز
وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ	کی پیروی کرو جو تمہارے خداوند کی
رَبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا	جانب سے تمہاری طرف وحی کی جاتی
تَعْمَلُونَ خَبِيرًا	ہے، بیشک جو کچھ تم لوگ کرتے ہو اللہ
(احزاب: ۱ و ۲)	اس سے واقف ہے،

خطاب واحد کے صیغہ سے شروع ہوا اور درمیان میں بھی واحد ہی کے صیغے آئے مگر روئے سخن پوری جماعت کی طرف تھا اس لیے آخر میں جمع کا صیغہ لایا گیا جس سے صاف واضح ہو گیا کہ یہ خطاب امت سے ہے، چنانچہ بعد کی آیتوں سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے فرمایا:-

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ	اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی
وَكِيلًا مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ	بس کارساز ہے، اللہ نے کسی آدمی
مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ وَمَا	کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے اور نہ

جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰئِیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَاۗءَكُمْ اَبْنَاۗءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (احزاب: ۴،۳)

تم لوگوں کی بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا، یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔

اگر خطاب محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا تو جمع کے صیغے اور ضمیریں کیوں لائی جاتیں۔

سورۂ انعام کی آیت ۶۸ میں بھی خطاب کی بعینہ یہی صورت ہے، پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا لیکن دراصل روئے سخن پوری قوم کی جانب ہے اور آپ کے واسطے سے اسے تعلیم وہدایت دینی مقصود ہے اسی لیے بعد کی آیت ۶۹ میں صراحۃً خطاب کا رخ تمام مسلمانوں کی جانب ہوگیا ہے کہ اہل تقویٰ پر کفار ومشرکین کے حساب کی کچھ ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کا کام محض تذکیر وہدایت ہے اس کے بعد بھی اگر لوگ بحث وحجت پر آمادہ ہوں تو مسلمان ان سے کنارہ کش ہوجائیں کیونکہ نہ ظلم کرنے والوں کا محاسبہ مسلمانوں کا کام ہے اور نہ ان کی غلط حرکتوں کی ذمہ داری ان کے سر ہے، یہی مفہوم ایک اور آیت میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا

اور وہ (خدا) کتاب (قرآن) میں تم پر یہ (ہدایت) نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو تم ان کے

فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (نساء: ۱۴۰)

پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہوجائیں ورنہ تم بھی ان ہی کے مانند ہوجاؤ گے۔

اس آیت میں وہی تعلیم دی گئی ہے جو پہلے سورۂ انعام میں دی جاچکی ہے چنانچہ اس کا حوالہ بھی اس میں دیا گیا ہے لیکن یہاں خطاب کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے پوری امت کی جانب ہے اس سے بداہۃً یہ ثابت ہوگیا کہ سورۂ انعام میں بھی خطاب عام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص نہیں ہے، بعض مفسرین نے بھی سورۂ انعام کی آیت (۶۸) کے بارے میں قطعی طور پر صراحت کی ہے کہ اس میں پوری امت سے خطاب ہے امام رازیؒ فرماتے ہیں 'کہا گیا ہے کہ خطاب گو نبیؐ سے ہے مگر مراد آپؐ کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبیؐ کے علاوہ ہی سے خطاب ہے'[1] ابوحیان کا بیان ہے "خطاب نبیؐ سے ہے مگر اس میں مسلمان بھی شامل ہیں کیونکہ نہی کی علت آیات اللہ میں بکواس کو سننا ہے جو نبی کی طرح دوسروں کو بھی شامل ہے"[2] علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں "اس سے مراد امت کا ہر فرد ہے کہ وہ ان مکذبین کے ساتھ نہ بیٹھے جو اللہ کی آیتوں کی تحریف و تکذیب کرتے ہیں"[3]

اس سے واضح ہوگیا کہ آیت (۶۸) میں خطاب گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں پوری امت شامل ہے، اسی طرح آیت (۶۹) وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ میں ضمیر کا مرجع بھی کسی اشتباہ کے بغیر پوری طرح متعین اور معلوم ہے

---

[1] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۹۲ [2] تفسیر ابو حیان ج ۴ ص ۱۵۲ [3] تفسیر القرآن الکریم ج ۲ ص ۱۳۴

کہ وہ کفار و مشرکین کی جانب ہے اور مفہوم یہ ہوگا کہ متقین پر کفار کے اعمال کی کوئی ذمہ داری اور جواب دہی نہیں ہے کیونکہ ان کی ذمہ داری محض ذکری (یاددہانی) اور تبلیغ ہے، اس کے بعد وہ بری الذمہ ہو گئے، چاہے کوئی ایمان لائے یا نہ لائے لیکن آیت (۵۲) میں ضمیروں کا مرجع اس قطعیت کے ساتھ متعین ہے اور نہ خطاب کا عموم ہی پوری طرح واضح ہے، اس لیے یہ بحث کسی قدر تفصیل کی متقاضی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی شفقت و رافت کی بنا پر اپنی قوم خصوصاً رؤسائے قریش کی اصلاح و ہدایت کے بہت زیادہ آرزومند اور حریص رہتے تھے، چنانچہ کبھی کبھی تبلیغ و دعوت میں آپ کا جوش و انہماک اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ کفار کے تمرد و سرکشی اور شدید عناد و انکار کے باوجود آپ ان کی جانب سے مایوس اور بددل نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک ہمدرد، شفیق اور خیرخواہ طبیب کی طرح نہایت دلسوزی کے ساتھ مریضان کفر و ضلالت کی اصلاح کے لیے سرگرم عمل رہتے اور ان کے تمرد و انکار کے باوجود دعوت و تبلیغ کی سرگرمی و انہماک میں کمی نہ آنے دیتے، بلکہ محبت کے جوش اور دعوت حق میں سرگرمی و غلو کی بنا پر اعراض و انکار کی تمام سختیاں برداشت کرتے اور منکرین عناد و مخالفت کے ہیجان میں جتنے ہی آپ سے دور ہٹتے جاتے تھے آپ محبت و رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے تھے، ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں۔

"اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمۃ للعالمین کی خاص صفت تھا اور جس نے آپ کی نگاہوں میں دشمنوں کو بھی عزیزوں سے زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً رسالت عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس،

ثالثاً یہ خیال کہ طاقت وروں اور دولت مندوں کا ایمان دین حق کی تائید و تقویت کا باعث ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقون الاولون کے ذریعہ سے آپ کے اس خیال کی تصدیق فرمادی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر و جہاد مطلوب ہے اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہو جائے۔[1]

یہ شدید غلو و تجاوز دیکھ کر لسان الٰہی کو تنبیہ کرنی پڑی کہ

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (کہف: ۶)

شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مارے غم کے اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے، اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (شعراء: ۳)

شاید تم اس بنا پر اپنی جان ہلاک کر ڈالو کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں

یہ بھی فرمایا کہ اگر کفار و مشرکین ایمان نہیں لاتے تو آپ ہرگز قابل ملامت نہیں ہیں،

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ (ذاریات: ۵۴)

پس تم ان سے اعراض کرو، تم قابل ملامت نہیں ہو۔

تبلیغ و دعوت میں اس قدر الحاح و اصرار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے کام لیتے تھے کہ آپ کو اللہ کی طرح غیب کا علم نہیں تھا، چنانچہ خدا نے تنبیہ فرمائی کہ

[1] تفسیر سورۂ عبس اردو ترجمہ ص ۱۷۔

یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت نہ ضائع کرو انکی جانب اس قدر اعتنا و التفات کی وجہ سے ان مومنین کی حق تلفی ہو رہی ہے جو خدا کی عبادت و طاعت میں اخلاص و سرگرمی سے لگے ہوئے ہیں آپ کو ان کی اصلاح و تربیت سے غافل نہیں ہونا چاہیے، وہ آپ کی شفقتوں اور توجہات کے زیادہ مستحق ہیں۔

دوسری جانب روسائے قریش کہتے تھے کہ آپ پر ایمان لانے والے کمزور اور مفلوک الحال لوگ ہیں جو ہمارے مقابلہ میں نہایت کمتر، گھٹیا اور پست ہیں، جب ایسے گئے گذرے لوگ آپ کے ساتھ ہیں تو بھلا ہم کس طرح آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں، یہ ذلت و رسوائی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے کہ اس درجہ معمولی لوگوں کے ساتھ ہم نشست و برخاست رکھیں، اگر ہم کو اپنی بات سنانا ہے تو ان رذیل لوگوں کو اپنی مجلسوں سے دور کر دیجئے، گذشتہ انبیاءؑ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آتا رہا ہے، حضرت نوحؑ کی دعوت حق کے جواب میں ان کی قوم کے سرداروں نے کہا:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا	پس کافر سرداروں نے کہا ہم تو تمھیں
مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا	اپنے ہی جیسا آدمی سمجھتے ہیں اور ہم تو
نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ	دیکھتے ہیں کہ تمھاری پیروی ہمارے
هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ	اندر سے صرف رذیل (اور سطحی) لوگوں
وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ	نے کی اور ہم اپنے اوپر تمھاری کوئی
بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝	برتری بھی نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ
(ھود: ۲۷)	ہم تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ	لائے، نوح) کیا ہم تم پر ایمان لائیں جبکہ
قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا	تمھاری پیروی پست لوگوں نے کی ہے
يَعْمَلُونَ ۝ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا	(نوح نے) کہا مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے
عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۝ وَمَا	ہیں، ان کا معاملہ تو میرے رب کے
أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ	ذمہ ہے کاش تم لوگ جانتے اور میں
أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝	مومنین کو دھتکارنے والا نہیں، میں تو
(شعراء: ۱۱۱ تا ۱۱۵)	صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر ابتداً ایمان لانے والے عموماً کمزور اور پست لوگ ہوتے ہیں اس کی وجہ سے جبابرۂ قوم بدکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ایسے ذلیل و خوار لوگوں کے ساتھ ہم کس طرح رہیں گے ان کے ہوتے ہوئے ہم آپ کی بات سننے کے لیے آپ کی مجلس میں آنا بھی گوارا نہیں کر سکتے، مفسرین نے آیت کے شان نزول میں جو واقعہ تحریر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ضعفائے مسلمین کی جماعت کو دیکھ کر آپ سے فرمائش کی تھی کہ انکو اپنی مجلس سے اٹھا دیجئے تاکہ ہم بھی آپ کے پاس آسکیں، ممکن ہے اسی وجہ سے ہمیں بھی خدا ایمان کی توفیق دے۔

سورۂ انعام کی آیت (۵۲) میں انہی لوگوں کے خیال کی تردید کر کے ان کی ذہنیت پر ضرب کاری لگائی گئی ہے اسکا ماحصل یہ ہے کہ اے پیغمبر تمھاری شفقت و توجہ اور تربیت و عنایت کے اصل مستحق یہ غربائے مسلمین ہیں نہ یہ مغرور و متمرد لوگ تو ان کے پیچھے پڑ کر اصل حقداروں کے حقوق میں کمی اور کوتاہی نہ کرو، قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ایمان لانے کی توقع

ہیں اور ان کے کہنے سے غربا اور ضعفائے مسلمین کو اپنے سے دور نہ کرو، یہ سربرآوردہ لوگ کسی حال میں بھی اپنی روش سے باز آنے والے نہیں ہیں، اس لیے ان کے پیچھے خواہ مخواہ وقت نہ ضایع کرو، کیونکہ اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو نہ اس میں تمہارا کوئی قصور ہے اور نہ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری ہے، تم سے ان کے ایمان کے بارے میں خدا کے یہاں کوئی مواخذہ نہ ہوگا، اسی طرح تمہاری جو اصل ذمہ داری ہے اس کو یہ لوگ اٹھانے والے نہیں ہیں کہ ان کے مطالبے پر تم ان مومنین کو اپنے سے دور کردو جو صبح و شام اللہ کی عبادت و اطاعت میں مشغول اور سرگرم رہتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس جیسی دوسری آیتوں میں اصلاً روسائے قوم کی تہدید و توبیخ مقصود ہوتی ہے جو ایمان نہ لانے کا یہ عذر خواہ مخواہ تراش لیا کرتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھی تو غربا اور عوام کے طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہیں ایسے رذیل لوگوں کے ساتھ ہم شرفا کس طرح رہیں گے، ان کے ساتھ مل بیٹھنے میں تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، اسی ضمن میں آپ کو یہ تنبیہ کی گئی کہ ان کو پانے کے لیے آپ اپنے لوگوں کو نہ کھوئیے، متمرد لوگوں کی جانب غیر معمولی میلان و التفات سے اگر اللہ کے مخلص بندوں کے معاملہ میں غفلت ہو گئی تو آپ ظالم لوگوں اور حق مارنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔

طرد کے معنی دھتکارنے، دھکا دے کر دور کرنے اور ہٹانے کے ہیں، اس سے بظاہر ضعفائے مسلمین کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے مگر در اصل اس سے مشرکین کی اس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کو دھتکار دیں تب ہی وہ آپ کی بات سننے اور آپ کے پاس بیٹھنے کے لیے آمادہ ہونگے،

چنانچہ آیت ۵۴ میں اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ جب یہ مومنین آپ کے پاس آئیں تو ان کا استقبال کیجئے اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیجئے، فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اس لیے کہ آپ کی توجہ و عنایت کے اصل مستحق یہی لوگ ہیں اور انہی کی اصلاح و تزکیہ اور ہدایت و تربیت فی الواقع آپ کی ذمہ داری ہے، رہے وہ بدمست لوگ جو اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، ان کی کوئی ذمہ داری بجز تبلیغ و دعوت آپ پر نہیں ہے، جب آپ نے انہیں دعوت پہنچا دی تو آپ کا کام ختم ہو گیا، ان کو ہدایت دینا آپ کا کام نہیں، آپ خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑ کر اللہ کے مخلص بندوں کی جانب سے غافل اور ان کے حقوق میں کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں، اسی مفہوم کی جانب سورۂ کہف کی آیات ۲۸ و ۲۹ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ آیت (۵۲) میں خطاب گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اس میں اصل تہدید و وعید کفار و مشرکین کو کی گئی ہے، عتاب کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے قریش کے سرداروں کی جانب ہے جو دولت و اقتدار کے نشہ میں آپ سے کہتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کو اپنے سے دور کیجئے تب ہم آپ کی مجلس میں آئیں گے۔

۲۔ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دوسرے تمام داعیان حق کو یہ تعلیم و ہدایت دینی مقصود ہے کہ وہ متکبرین اور ذی وجاہت لوگوں کے ایمان لانے کے چکر میں پڑ کر اپنے خاص متبعین اور اپنی جماعت کے مخلص افراد سے غافل نہ ہوں، آوارہ بھیڑوں کی تلاش میں اپنے گلہ کی بھیڑوں کو بھی ضایع کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں ایسی آیتیں بہت ہیں جن میں خطاب تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر آپ کے واسطے سے پوری امت کو تعلیم و ہدایت دینا مقصود ہوتا ہے مثلاً

فرمایا:

وقضى ربك ألا تعبدوا إلا
إياه وبالوالدين إحسانا
إما يبلغن عندك الكبر
أحدهما أو كلاهما فلا تقل
لهما أف ولا تنهرهما
وقل لهما قولا كريما واخفض
لهما جناح الذل من الرحمة
وقل رب ارحمهما
كما ربياني صغيرا
(بنی اسرائیل: ۲۳ و ۲۴)

اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اُس کے
سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں
باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک
کرو، اگر وہ تمہارے سامنے بڑھاپے
کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں
تو ان کو نہ اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو
اور ان سے شریفانہ (انداز میں) بات
کہو اور ان کے لیے رحمدلانہ اطاعت
کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے
رہو کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما
جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

ان آیتوں میں واحد کا صیغہ لایا گیا ہے اور خطاب بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مقصود عموم ہے اور آپ کے واسطے سے درحقیقت آپ کی پوری امت کو یہ ہدایت کی گئی ہے، یہ بات یہاں اتنی واضح ہے کہ معمولی غور و فکر کرنے والے سے بھی مخفی نہیں رہ سکتی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین تو زندہ ہی نہیں تھے اس لیے آپ کو انکے ساتھ حسن سلوک کا حکم دینے کے کیا معنی؟ سورۂ نصر میں آپ کو استغفار کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی بھی یہی نوعیت ہے، مخاطب گو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے لیکن دراصل یہ تعلیم سب مسلمانوں کو دی گئی ہے، سورۂ انعام کی آیت ۵۲ میں بھی خطاب کی یہی نوعیت اور انداز ہے،

آیت کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس سے ضمیروں کا مرجع خود متعین ہو جاتا ہے یعنی آیت ۶۸ کی طرح آیت ۵۲ میں بھی دونوں ضمیروں کا مرجع کفار و مشرکین کی جانب ہے مگر عام طور سے مفسرین نے ان کا مرجع مسلمانوں کو مانا ہے، ان کے استدلال کی اصل بنیاد سورۂ شعراء کی وہ آیتیں ہیں جو حضرت نوحؑ کے سلسلہ میں آئی ہیں اور جن کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، ان کے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے پیغمبر تم کفار کے کہنے سے ان مسلمانوں کو اپنے سے دور نہ کرو جو خدا کی عبادت و اطاعت میں مصروف ہیں خواہ وہ پست اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ مسلمان کیسے ہیں اور نہ تم کو اس سے کوئی بحث ہے کہ پہلے انکی کیا حالت تھی، اب جب یہ ایمان لائے ہیں تو ان کو اپنے اندر شامل کر لو مگر یہ جچتی تاویل نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس صورت میں بعد کے فقرہ وما من حسابک علیہم من شیئ کا کوئی مفہوم نہیں بنتا بلکہ وہ ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں پر آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں، اس اشکال سے بچنے کیلئے بعض حضرات نے آیت کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ آپ پر نہ مسلمانوں کے رزق کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ ان پر آپ کے رزق کی کوئی ذمہ داری ہے،

مگر موقع کلام سے یہ مفہوم زیادہ واضح نہیں ہے، اصلاً تو اس آیت میں مشرکین اور جاہلان قریش کو عتاب مقصود ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کو اپنی مجلس سے اٹھانے اور دھتکارنے کا مشورہ اس لیے دیتے تھے کہ ان خستہ حال لوگوں کی موجودگی میں ہمارے لیے تمہارے پاس بیٹھنا ذلت و رسوائی کی بات ہے، ان کے جواب میں آپ سے کہا گیا کہ تم ہرگز انکو نہ دھتکارو بلکہ انہیں اپنی توجہ اور ہمدردی کا مرکز بنائے رکھو، وہ یقیناً تمہاری اصلاح و تربیت کے زیادہ مستحق ہیں، رہے یہ کفار تو یہ ایمان لائیں یا نہ لائیں اس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے تمہارا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے اس کو پورا کر دو، اس کے بعد بھی یہ ایمان نہ لائیں۔

تو تم کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان کا معاملہ خدا کے ذمہ ہوگا، تمہارے ذمہ نہ ہوگا، اسی طرح انکے ذمہ بھی تمہارا کوئی معاملہ اور ذمہ داری نہیں کہ تم انکے کہنے سے مومنین کی اصلاح و تربیت چھوڑ کر انکے پیچھے اپنا وقت ضائع کرو اور مومنین کی خبر نہ لو، ان پر تمہارے اعمال کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت کی اس کمی اور کوتاہی کی تلافی کر سکیں گے جو مومنین کے باب میں تمہاری جانب سے ہوگی،

غرض نہ کفار و مشرکین کے اعمال کے تم جوابدہ ہو اور نہ وہ تمہارے کاموں کے جوابدہ ہیں کہ انکی وجہ سے مومنین کی جانب سے بے پرواہ ہو جاؤ اور انکی حق تلفی کر کے ظالموں میں ہو جاؤ، بعینہ یہی بات آیت ۶۹ میں بھی کہی گئی ہے کہ متقیوں پر سمجھانے بجھانے کے علاوہ آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعلقی کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ہے بلکہ آیت زیر بحث میں آپؐ کو مسلمانوں کو قریب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہی لوگ آپکی عنایت، شفقت، دلجوئی، حوصلہ افزائی، توجہ اور اصلاح و تربیت کے زیادہ مستحق ہیں، ایسی صورت میں یہ کہنے کے کیا معنی ہونگے کہ آپ پر مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری نہیں اور نہ ان پر آپؐ کی کوئی ذمہ داری ہے۔

سورۂ عبس کی ابتدائی آیتوں میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے پیچھے ہلاک ہونے کے بجائے مومنین کیجانب التفات کرنا اور انکے تزکیہ و تطہیر کے عمل میں منہمک ہونا چاہیے، اعراض و استغنا کرنے والے کے سدھرنے اور پاکیزہ ہونے کی نبی پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ

اس بنا پر سورۂ انعام کی آیت (۵۲) میں ضمیروں کا مرجع مومنین کے بجائے کفار کیجانب ہوگا

جن کا ذکر اوپر کی آیتوں میں مذکور ہے اور اگر حضرت نوحؑ کا ارشاد تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس سے بحث نہیں کہ میرے ساتھ کون لوگ ہیں، انکے بھلا برے کی ذمہ داری میرے خداوند پر ہے، میں تو مومنین کا ایسے قدر داں ہوں کہ انہوں نے میری دعوت پر لبیک کہا ہے، میں تمہارے کہنے سے انکو نہیں بھگا سکتا۔

اب آخری سوال کو لیجئے، سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیتوں سے دعوت دین کے متعلق حسب ذیل اصولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ داعیان حق کو ان لوگوں کے پیچھے اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے جو انکار کی روش پر جمے ہوئے ہیں اور غرور و گھمنڈ میں سرشار ہو کر یہ کہتے ہیں کہ کمتر اور گھٹیا مسلمانوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ہماری سبکی [illegible] ہے، اسی طرح ایسے داعی کو ایمان لانے والوں سے غفلت و بے توجہی کر کے ظلم کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے، خاطیوں اور ظالموں کے ایمان لانے کی توقع میں اپنی جماعت کے قیمتی افراد کی تربیت و تزکیہ سے بے پروائی اور انکو کھونے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات ہی سننا نہیں چاہتے بلکہ سراسر کج بحثی، مذاق اور تمسخر پر آمادہ ہیں داعی کو ان سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے اور حق کی دعوت اسوقت پیش کرنا چاہیے جب سننے والا موڈ میں ہو لیکن اگر اسکا موڈ بگڑا ہوا اس پر مخالفت کا جنون سوار ہو وہ حق کا مذاق اڑا رہا ہو اور سراسر آمادۂ تضحیک و تکذیب ہو تو اسوقت دعوت کو پیش کرنا دعوت کی تحقیر و رسوائی کا سامان کرنا ہے، دعوت کی تخم ریزی کیلئے مناسب موقع، موزوں وقت، ساز گار حالات اور مخاطب کے اچھے موڈ کا انتظار کرنا چاہیے۔

۳۔ جب کسی مجلس میں حق کا مذاق اڑایا جا رہا ہو تو اسمیں دعوت کو پیش کرنا تو درکنار اسمیں جانا اور تمسخر کرنے والوں کیساتھ نشست و برخاست سے بھی داعی کو پرہیز کرنا چاہیے، بھول چوک کی الگ بات ہے مگر یاد آنے کے بعد متنبہ ہونا اور دین کیساتھ تلعب کرنے والوں کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرنا ظلم ہے۔

۴۔ داعی کی ذمہ داری صرف تذکیر و تبلیغ حق ہے، کسی کے دل میں ایمان کو اتار دینا اور ذہن میں جما دینا اس کا کام نہیں۔

"ض"

معارف کی ڈاک

مکتوب پیرس

منگل ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مخدوم و محترم محمد عارف عمری صاحب زاد فیضکم ! سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اپریل رواں کے معارف میں عبد بن حمیدؒ پر آں محترم کا مقالہ پڑھا۔ ماشاء اللہ حق تحقیق ادا کر دیا ہے۔ جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔

کیا یہ ناچیز آں محترم کو ایک زحمت دے سکتا ہے ؟

استانبول میں ایک مخطوطہ ہے : کتاب السرد والفرد فی صحائف الاخبار ونسخہا المنقولۃ عن سید البشر ﷺ، مما الفہ ابوالخیر أحمد بن اسمٰعیل القزوینی، یہ کوئی ۵۹۰ھ کے ایک نامعلوم مولف ہیں اور اپنی اسناد میں ایک ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا خاص کر آں آخر الذکر کا آپ کو کوئی پتہ چلتا ہے ؟

کتاب کے آغاز میں ہے : اخبرنا ابو محمد الموفق بن سعید ..... الموفق الفیرودی بقرأتی علیہ فی جمادی الاولیٰ سنۃ اربع وثلاثین وخمسمائۃ و ابو نصر محمد بن عبداللہ الارغیانی فی کتابہ قال انا ابو علی الحسن بن ابی القاسم محمد بن محمد بن حمویہ الصفار فی ذی القعدۃ سنۃ ست وستین واربعمائۃ، انا ابو سعد عبد الرحمٰن بن محمد بن محمد النصر وی سنۃ خمس وعشرین واربعمائۃ، نا ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی فی رجب سنۃ ست وستین وثلاثمائۃ

نا الفقیہ العامل ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبد الرحمٰن بن شیرویہ المدینی وجدی لامی ابو محمد احمد بن ابراھیم بن عبداللہ بن الی نصر، قالا نا ابو یعقوب اسحٰق بن ابراھیم بن مخلد الحنظلی المروذی نا عبد الرزاق بن ھمام بن نافع الصنعانی، نا معمر، نا ھمام بن منبہ، قال ھذا ما حدثنا ابو ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ....

اگر تلاش میں زحمت ہے تو پھر اس عریضے کو ردی کر دیجئے۔

عید مبارک

ناچیز ح

ایک ادنیٰ طالب علم کے حقیر مضمون کی ڈاکٹر صاحب جیسے متبحر عالم اور نامور فاضل کی یہ تحسین یقیناً انکی عالی ظرفی اور اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی ہے اس سے پہلے بھی دسمبر ۱۹۸۸ء کے معارف میں ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد کے متعلق ان کا گرامی نامہ شائع ہوا تھا، اور اب انھوں نے اس کے متعلق اس ناچیز کو بھی تحریر فرمایا ہے،

تلاش و جستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر مخطوطہ میں کاتب نے اَلسَّمَذِی کو غلطی سے السندی لکھ دیا ہے، اسی وجہ سے کتابوں میں ان کا ذکر نہ مل سکا۔ ابو محمد بن عبداللہ بن زیاد السندی درست نہیں ہے، صحیح ابو محمد عبداللہ بن محمد بن علی بن زیاد اَلسَّمَذِی ہے، انھوں نے عبداللہ بن محمد بن شیرویہ سے اور ان سے عبد الرحمٰن بن حمدان النصروی نے روایت کی ہے، انکے مزید حالات کیلئے (کتاب الانساب علامہ سمعانی جلد ۷، ص ۲۱۷ [illegible] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) اور (المشتبہ فی اسماء الرجال، امام ذہبی ص ۳۰۲، ۲۰۵ مطبوعہ لائیڈن) دیکھی جا سکتی ہے،

(محمد عارف عمری)

مکتوب مدینہ منورہ

۱۹-۲-۲۰۰۹ء محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ مورخہ ۶ فروری، فروری کے آخری ہفتہ میں مل گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی مصروفیات دارالمصنفین کے تعلق سے بھی معارف کی وجہ سے خاصی بڑھ گئی ہیں اور وقت نہیں نکل پاتا ہوگا، مگر تفسیر سورۂ لہب کے تعارف کے بعد جی یوں چاہتا تھا کہ اسی طرح دوسری تفسیروں کا تعارف بھی آپ لکھ دیتے تو اچھا ہوتا۔ جناب صباح الدین صاحب مرحوم نے سید صاحب کی کتابوں پر اسی طرح کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس تعارف سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

خدابخش سیمینار کی روداد پڑھکر یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ مولانا فراہی اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی پر کن لوگوں نے مضامین پڑھے، آپکا مضمون کس پر تھا، مباحثہ کا کیا رنگ تھا، [illegible] صاحب کا کیا موقف رہا، الاصلاح سے کیا کوئی شریک ہوا تھا؟ ادارہ علوم القرآن کی کوئی نمائندگی ہوئی یا نہیں؟

تازہ شمارہ میں "[illegible]" کے عنوان سے جو مضمون چھپا ہے اسکے آخر میں مضمون نگار نے عربی فارسی اردو وغیرہ میں بائبل کے ان ترجموں کی ایک فہرست دی ہے جو انکی تحقیق میں مسلم دانشوروں کے قلم سے نکلے ہیں، اس فہرست میں پہلا ترجمہ "[illegible]" مذکور ہے مترجم کے خانہ میں "بستانی لبنانی" لکھا ہے، واضح رہے کہ یہ بستانی لبنانی کوئی مسلم دانشور نہیں ہے بلکہ لبنان کا ایک مشہور عیسائی خاندان ہے، بائبل کا عربی ترجمہ غالباً ودیع بستانی (۱۸۸۶-۱۹۵۴ء) کے قلم سے ہے۔ اس عیسائی ادیب نے مہابھارت کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔

مولانا عبدالباری [illegible] صاحب، عمیر صاحب اور برادرم عارف [illegible] سے سلام کہیں۔ محمد اجمل

[illegible] (۱) مقدمہ تفسیر فتح الرحمن (شاہ ولی اللہ دہلوی)، (۲) تفسیر سورۃ [illegible] [illegible] قرآن پر ڈاکٹر ظفر الاسلام [illegible] علی گڑھ نے مقالہ پیش کیا تھا [illegible] ڈاکٹر اشتیاق احمد [illegible] ڈاکٹر ظفر الاسلام شریک ہوئے تھے۔

وفیات

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی

از

حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاصر امپیکٹ انٹرنیشنل لندن مورخہ ۹ مارچ سے یہ افسوسناک خبر ملی کہ ۲۰ جنوری ۲۰۰۹ء کو کراچی میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن بہار کے ضلع گیا کا ایک گاؤں [illegible] ہے جو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے وطن دیسنہ سے صرف سولہ سترہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۱۹۲۲ء میں جب وہ گیارہ برس کے تھے تو اپنے والد مولانا اویس حسین صاحب کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے، اسی سال ان کو مئو کے مدرسہ عالیہ میں مولانا عبدالرحمن صاحب کے سپرد کردیا گیا جو میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے شاگرد اور ان کے والد کے ہم سبق تھے، مدرسہ عالیہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ۱۹۲۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں سند تکمیل حاصل کی۔

بچپن سے نیک اور سعید تھے، مئو میں جب وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی تھی، اسی زمانہ میں وہاں تحریک ترک موالات کا ایک جلسہ ہوا جس میں جب ہزاروں کے مجمع میں انھوں نے تقریر کی تو تمام لوگوں نے اسے حیرت و مسرت سے سنا، حضرت سید صاحبؒ اس جلسہ کے صدر تھے، انھوں نے بھی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے سر پر ہاتھ

رکھ کر دعا دی، مولانا ہاشمی عمر بھر اس دستِ شفقت کی گرمی محسوس کرتے اور حضرت سید صاحبؒ کی عنایات و ہدایات سے مستفید ہوتے رہے، ندوہ میں سید صاحبؒ نے ان کے درجہ میں تاریخ اسلام پر کئی لکچر دیے، سید صاحبؒ وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے حجاز گئے، واپس تشریف لائے تو ندوہ کے اساتذہ و طلبہ کی طرف سے ایک استقبالیہ جلسہ ہوا، اس میں مولانا ہاشمی نے ایک قصیدہ پیش کیا، طالب علمی کے دور کا یہ قصیدہ بعد میں وہ خود بھی بھول گئے مگر یہ دو شعر ذہن میں محفوظ رہ گئے تھے۔

مژدہ اے بلبلِ شیدا کہ بہاراں آمد — بر سر اوج سما ابر خراماں آمد

گل رفتہ ز چمن باز بہ بستاں آمد — سید آمد بہ وطن روح بہ گنبدِ تن

ان کی علمی صلاحیت اور استعداد کو دیکھ کر سید صاحبؒ نے ان کو دارالمصنفین میں بلانا چاہا مگر اتفاق سے اسی زمانہ میں ان کو رام پور کے کتب خانہ میں مخطوطات پر کام کرنے کی دعوت بھی ملی جس کے لیے وہ پہلے سے رضامند ہو چکے تھے، اس لیے دارالمصنفین تشریف نہ لا سکے مگر وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں برابر حاضری دیتے رہے کچھ عرصہ بعد وہ حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی تھی اور دار السلام کی عمارات میں ایک قومی کتب خانہ، ایک اسلامی دار الاقامہ اور علوم مشرقیہ کی ایک چھوٹی سی درسگاہ بھی قائم کی تھی، اپنے سیاسی و مذہبی خیالات کی آبیاری کے لیے نواب بہادر یار جنگ کی نظر انتخاب مولانا ہاشمی پر پڑی، چنانچہ ان اداروں کی سربراہی ان کو سونپ دی گئی، حضرت سید صاحبؒ ان کے اس انتخاب پر بہت خوش ہوئے اور بعد میں ایک موقع پر بطور فخر و شکر یہ لکھا کہ

"ندوہ کے لیے یہ شکر کا مقام ہے کہ دین و دنیا کی جامعیت کے ساتھ جب کہیں کوئی کام شروع ہوتا ہے تو اس کے فرزند اس کے لیے بہترین اہل ثابت ہوتے ہیں، مولوی عبدالقدوس

ہاشمی جو تکمیل کے بعد ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے، نواب بہادر جنگ کی رفاقت کے لیے بہترین رفیق ثابت ہوئے"

حیدرآباد میں ندوہ کے لیے جو کوششیں ہوئیں ان کا ذکر سید صاحبؒ نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام ایک خط میں اس طرح کیا۔

"..... اس دفعہ حیدرآباد میں ندوی برادری نے بھی کام کیا، دائرۃ المعارف والوں نے دو سو اور تنہا عزیزی عبدالقدوس ہاشمی نے جو نواب بہادر یار جنگ کے دست راست ہیں آٹھ سو پورے کیے"

مولانا ہاشمی جہاں بھی رہے، سید صاحب سے ربط و تعلق میں کوئی کمی نہیں آئی، انھوں نے علامہ محمود حسن خاں ٹونکی کی نگرانی میں معجم المصنفین کی تالیف میں بھی حصہ لیا، ایک مصنف احمد بن طغرل بک کے حالات تلاش کرنے میں دشواری ہوئی تو انھوں نے یورپ کے مشاہیر مستشرقین کو خطوط لکھے ان میں پروفیسر مارگولیوتھ نے جو جواب دیا اس سے وہ مطمئن نہیں ہوئے، اپنے شبہات کے اظہار کے ساتھ انھوں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں پروفیسر موصوف کا جواب بھیج دیا اور مدد بھی مانگی، سید صاحبؒ نے جو جواب دیا اس کو وہ ہمیشہ حرز جان بنائے رہے، در حقیقت یہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک عمدہ ہدایت ہے، سید صاحبؒ فرماتے ہیں

"..... دوسرے علماء اور مستشرقوں کی تخفیف نہ کیا کرو، یہ طریقہ اہل علم کی شان سے بعید ہے، دوسروں کی تخفیف و تغلیط میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے، ضائع ہو جاتا ہے، جب تک خود تحقیق نہ کر لو کچھ نہ لکھو، دوسروں کی تحقیق کو اس وقت تک کے لیے قبول کرو جب تک خود تحقیق نہ کر لو....."

سید صاحبؒ سے وہ اسی طرح فیض اٹھاتے رہے، کراچی میں سید صاحبؒ دارالمصنفین کی طرح کا ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی نظامت کے لیے ان کی نظر مولانا ہاشمی پر پڑی، مگر ناسازگار حالات نے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے نہیں دیا، ابھی چند برس پہلے دائرۃ السلیمانیہ کے نام سے کراچی میں ایک بڑے علمی ادارہ کا پروگرام مرتب ہوا تو اس کے سرپرستوں میں مولانا ہاشمی کا نام سرفہرست تھا۔

سید صاحب ان کی صلاحیتوں کے جس قدر معترف تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب دستور پاکستان کی ترتیب کے متعلق سید صاحبؒ نے جلسہ منعقد کیا اور اس میں مولانا مودودی، مولانا بنوری، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مختلف فکر و مسلک کے جو ۳۲ علماء شریک ہوئے ان میں ایک مولانا ہاشمی بھی تھے۔

طالب علمی کے زمانہ ہی میں ان کی جس صلاحیت کو سید صاحب کی نگاہ جوہر شناس نے دیکھا تھا، اس کا ظہور برابر ہوتا رہا، پاکستان میں وہ معزز علمی عہدوں پر فائز ہوئے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد قائم ہوا تو اس کے کتبخانہ کے وہ ناظم ہوئے، بیرون پاکستان ان کی پذیرائی یوں ہوئی کہ وہ موتمر عالم اسلامی کے شعبۂ تحقیقات کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، رابطہ عالم اسلامی کی مجمع الفقہی کے وہ اہم ممبر تھے، انھوں نے اس کثرت سے بیرونی ممالک کے سفر کیے کہ ان کو علم و تحقیق کا جہانیاں جہاں گشت کہا جا سکتا ہے،

معاصر امپیکٹ نے لکھا ہے کہ وہ تقریباً چالیس کتابوں کے مصنف تھے ان کا ایک مختصر رسالہ مستشرقین اور تحقیقات اسلامی کے نام سے بہت مقبول ہوا، کئی برس پہلے اس رسالہ کی تلخیص راقم الحروف نے معارف میں پیش کی تھی، ان کی تحقیق کاوشوں کا ایک نمونہ کتاب تقویم تاریخی (قاموس تاریخی) کی شکل میں سامنے آیا جو ہجری اور عیسوی سنین کے

مابین ایک تقابلی تقویم ہے، مزید فائدہ کے لیے اس میں انھوں نے مشاہیر اسلام کے وفیات اور تاریخ اسلامی کے مشہور واقعات کی توقیت بھی کردی ہے،

پاکستان کے رسالہ فکر و نظر میں ان کے مضامین اہل نظر بڑی دلچسپی سے پڑھتے، قمری تقویم ہجری، رویت ہلال کی حقیقت، صفہ اور اصحاب صفہ، نظام خانقاہی تربیت گاہ نفس انسانی سیرت طیبہ کا مطالعہ، اسلام میں اجتہاد و قیاس کا مقام، تعمیر بیت اللہ الحرام اور سیرت انبیاء کمال انسانیت وغیرہ مضامین اہم ہیں، سیرت انبیاء کمال انسانیت تو اسلوب و طرز نگارش کے لحاظ سے خطبات مدراس کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔

ان کو صحافت سے بھی تعلق رہا ہے حیدرآباد دکن سے ایک ہفتہ وار اخبار تاجر کے نام سے نکالا تھا۔ کیا سے رسالہ ندیم جاری ہوا تو وہ بھی عملاً اس کی ادارت میں شریک رہے، رسالہ فکر و نظر کے بھی وہ کچھ عرصہ تک مدیر رہے۔

دارالمصنفین سے ان کو بڑی عقیدت تھی، جب وہ یہاں آتے تھے تو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو جب پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا تو ان سے خاص طور پر ملاقات کرتے تھے اور معارف میں بڑے کیف و لذت سے انکی پرلطف صحبتوں کا ذکر کرتے، ایک بار لکھا کہ "مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی تو علم و فن کے بلبل ہزار داستان ہیں، مذہبی، فقہی، تاریخی، علمی اور ادبی موضوعات پر ان سے زیادہ فاضلانہ اور پرمغز گفتگو کرنے والا میں نے کہیں نہیں دیکھا"

دارالمصنفین میں جب اسلام اور مستشرقین پر ۸۲ء میں ایک بین الاقوامی سیمنار ہوا تو وہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے موقر وفد کے ساتھ باوجود پیرانہ سالی کے تشریف لائے اور اس کو زندہ و تابندہ دیکھ کر باغ باغ ہوئے، سیمنار میں اپنی سادگی، لہجے

خلوص اور علمی شان کی وجہ سے وہ مرکز کشش بنے رہے، ان کا تعارف کراتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم نے فرمایا تھا کہ "اگر نقلی، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور دنیا بھر کے معلومات کا پیکر بنایا جائے تو وہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی ذات ہوگی"۔

افکار و خیالات میں توسع کے باوجود دین کے بنیادی عقائد میں وہ مداہنت پسند نہیں کرتے تھے، بینک کے سود کو حرام سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تو فرض ہے کہ مسلمان جہاں اور جس ملک میں طاقت رکھتے ہوں وہاں کے معاشی اور اقتصادی نظام کو ربوی آلودگیوں سے پاک رکھیں، البتہ جہاں وہ اقلیت میں ہیں ان کے لیے بینک کے سود کو بعض حدود و قیود کے ساتھ جائز سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات اور نیک اعمال کو شرف قبولیت بخشیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین،

بزمِ رفتگاں

بزرگوں، دوستوں، ہم عصروں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ، اس کی دو جلدیں ہیں، پہلی جلد میں مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفات پر نہایت پُرسوز تاثراتی مضامین ہیں، کہ ان دونوں بزرگوں سے فاضل مصنف کو والہانہ عقیدت تھی اور سید صاحبؒ تو انکے استاذ اور مربی تھے، دوسری جلد میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ذاکر صاحب، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ماہر القادری وغیرہ کی وفات پر مضامین ہیں۔ از سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم

قیمت ۲۳ روپیے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

فارسی واردو ادب میں تلمیحات واشارات

مرتبہ پروفیسر مجیب الرحمن صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۳۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپیے، پتے (۱) علمی مرکز ۴ پیر لین، کلکتہ (۲) عثمانیہ بکڈپو، کلکتہ،

یہ کتاب مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بہار یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی تھی، یہ پہلا انگریزی میں چھپا تھا اب اس کا اردو ترجمہ مزید اضافہ کے بعد شایع ہوا ہے، اس میں فارسی و اردو میں تلمیح، استعارہ اور کنایہ کے طور پر استعمال ہونے والے لفظوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کرکے ان کے اشارات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، مصنف کی زندگی فارسی واردو کی تدریس میں گذری ہے اور انہیں علمی و تحقیقی کاموں کا تجربہ بھی ہے اس لیے انھوں نے اس دقت طلب کام کو محنت و جستجو سے انجام دیا ہے، لیکن تلمیحات کے پس پردہ واقعات یا تو بے اصل ہوتے ہیں یا ان میں رطب و یابس اور غیر مستند باتیں بھی شامل ہوتی ہیں جن کے نقل سے نہ مفر تھا اور نہ ان کی صحت و عدم کی تحقیق کا یہ موقع تھا مگر بعض فروگذاشتیں قابل اصلاح ہیں جیسے پہلے ہی لفظ "آب حیات" کے متعلق لکھا ہے "کلام پاک کے سورہ (۱۸۔۸۳) میں ذوالقرنین کا ذکر ہے اللہ کا ماننے والا ایک بزرگ آب حیوان کی تلاش میں بحر ظلمات تک خضر کے ساتھ گیا تھا" خط کشیدہ باتوں کا ذکر قرآن میں نہیں، خود خضر کا ذکر بھی صراحتاً نہیں ہے اور اگر ہے تو حضرت موسیٰ کے ساتھ نہ کہ ذوالقرنین کے، ص ۲۷ پر لکھتے ہیں "قرآن (۲۔ ۳۶) کے مطابق آدم دو سو سال تک حوا سے الگ تھلگ الخ" دو سو سال کی بات قرآن کے مطابق نہیں، ص ۳۰ پر ہے "کلام پاک کی ۱۳۳ ویں آیت میں اسمٰعیل کے بیٹے 'ابنیہ یعقوب' کا لفظ آیا ہے" حوالہ میں دوسری سورہ کا ذکر رہ گیا ہے اور وہاں ابنیہ "یعقوب"

کے بجائے "الٰہ ابائک ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق" درج ہے۔ اعراف کو بہشت و دوزخ کے درمیان میدان بتایا ہے (ص۲۹)، حالانکہ قرآن میں حجاب کا لفظ آیا ہے جس کے معنی پردہ، اوٹ، دیوار اور فصیل کے ہیں، حضرت یوسفؑ کے بھائی دو بار غلہ خریدنے مصر گئے، ایک بار بن یامین کے بغیر اور دوسری بار ان کو لے کر، مصنف نے ص۳۳ پر دونوں بار کے واقعات کو خلط ملط کردیا ہے۔ ص۳۷ پر اخوان الصفا کو صوفیوں کی جماعت بتایا ہے حالانکہ یہ فلاسفہ کی جماعت تھی، عقل اول کی تشریح میں عقول عشرہ کو صوفیوں کے عقیدے میں بتایا ہے (ص۱۲۸) جو فلسفی صوفیوں کا عقیدہ ہے، مشہور صوفی ذوالنون مصری کے معنی (مچھلی والے شخص) لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن میں ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (ص۱۱۳) یہ بڑی فحش غلطی ہے قرآن نے تو حضرت یونسؑ کو ذوالنون کہا ہے ذوالنون مصری سے اس کو کیا تعلق العیاذ باللہ، ص۱۰۲ پر اقبال کی مشہور نظم خضر راہ کے اس شعر

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب — جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

کو غالب کی طرف منسوب کیا ہے اور آگے غدیر خم کو خم غدیر لکھا ہے ص۱۶۸ پر حضرت موسیٰؑ کے متعلق لکھا ہے کہ "میں پورے زبور کا حافظ ہوں" انہیں توریت کا حافظ لکھا جاتا تو بات صحیح ہوتی، ص۱۷۰ پر حضرت عمرؓ کی کل عمر ۵۳ سال بتائی ہے، صحیح ۶۳ ہے۔ ابوحیان کی تفسیر کی مشہور کتاب "البحر المحیط" کو ڈکشنری بتایا ہے (ص۱۷۱) مسلمانوں کے بہتر۷۲ فرقوں میں بٹ جانے کو کسی بزرگ کی پیشینگوئی بتایا ہے (ص۲۳۶) حالانکہ یہ ارشاد نبویؐ ہے۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق یہ لکھنا "یہ حضرت علیؓ کی خلافت کے خلاف تھیں" (ص۲۴۳) مستشرقین کا انداز فکر و بیان ہے، وہ حضرت علیؓ کی خلافت کے خلاف نہ تھیں بلکہ ان سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کر رہی تھیں املا کی غلطیاں بھی ہیں تابع کو طابع لکھا ہے (ص۱۰۵) یاقوت کو یاقوتی (ص۲۱) اور ابن ہشام کو ابن حشام (ص۵۹) لکھا ہے ناموں کی اور غلطیاں بھی ہیں، آیات قرآنی بھی جابجا غلط لکھی گئی ہیں، ممکن ہے یہ کتابت کی غلطیاں ہوں۔ "ض"